اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

اپریل ۲۰۲۳ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب کی نئی تالیف

امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل

[پاکستانی تناظر میں]

عصر حاضر میں مسلم امہ کو جو چیلنجز درپیش ہیں، ان میں سے سب سے بڑے دو ہیں: ایک: زوال امت اور دوسرا مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ۔ ان چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلم اہلِ علم اور دینی قائدین نے اب تک جو حل پیش کیے وہ جزوی اور غیر مؤثر ثابت ہوئے ہیں لہٰذا نئی اپروچ کی ضرورت ہے جس کی وضاحت اس کتابچے میں کی گئی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صفحات: ۴۸ قیمت: ۸۰ روپے

مکتبہ البرہان

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)		
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب-خدشات و مضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
طلبہ کی اسلامی تربیت		
۹	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۰	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت-ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
اصلاحِ دینی مدارس		
۱۱	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۲	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۳	مدرسہ ڈسکورسز-مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶
۱۴	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
اسلامی تحریکیں		
۱۵	پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۶	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۷	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۸	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
تزکیۂ نفس		
۱۹	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
۲۰	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۲	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۳	اسلام اور تعمیر سیرت	۴۰۷
اسلام اور مغربی فکر وتہذیب		
۲۴	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۵	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۶	اسلام اور ردِّ مغرب	۲۱۶
تفہیم دین		
۲۷	مسلم نشاۃ ثانیہ-اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۸	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۲۹	رزم حق وباطل	۸۰
۳۰	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۱	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۲	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۳	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
باللغة العربية		
۳۴	السلطة التشريعية_ دراسة مقارنة	۱۵۰
English Books		
۳۵	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۶	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۷	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

۹۱-بابر بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔

ای میل ermpak@hotmail.com

نیا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے

اسلام اور تزکیۂ نفس

مغربی نفسیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

صفحات ۹۲۸

اسلام میں تعمیر شخصیت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی دوسری پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ

مکتبہ البرہان لاہور

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۷، شمارہ ۴، اپریل ۲۰۲۳ء / رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ

مشمولات

○ مقالۂ خصوصی

فریضۂ رمضان کی حکمتیں — سید ابوالحسن علی ندویؒ — ۴

○ فکرونظر

رجوع الی القرآن۔ضرورت، اہمیت اور طریق کار — مدیر — 9

○ تعلیم و تربیت

۔اسلامی تہذیب کے احیاء میں تعلیم کا کردار — ڈاکٹر محمد امین — ۱۲

۔یونیورسٹیوں کا حیاباختہ ماحول — حافظ عمران طحاوی — ۲۰

۔مجوزہ قومی نصاب کا ایک جائزہ — ۲۲

○ تفہیم مغرب

میڈیکل سائنس یا کھیل تماشہ — سید خالد جامعی — ۲۷

○ افغانستان

افغانستانی معیشت مستحکم ہو رہی ہے — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۲۹

○ تفہیم دین

۔فکر اسلامی ۔ روایت، جدت اور جدیدیت — ڈاکٹر محمد امین — ۳۴

۔فکر اسلامی پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی کانفرس — حافظ عمران طحاوی — ۴۲

۔اِمیج کلچر — مکرم محمود — ۴۴

۔ترکی میں اسلامی تبدیلی کیسے آئی؟ — پروفیسر عاصم حفیظ — ۴۷

○ تزکیۂ نفس

تصوف کی تجدید۔ضرورت، اہمیت اور طریقِ کار — مدیر — ۴۹

○ تبصرۂ کتب

Big Capital in an Unequal Word — اوریا مقبول جان — ۵۳

English Etiquette for Indian Gentlemen — آصف محمود — ۵۸

English Section ۶۶

Truth about Democracy Dr. Javead Akber Ansari

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0309-4607124)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے

سالانہ 1000 روپے۔پانچ سال: 5000 روپے

تاحیات 40,000 روپے

محمد خباب خزانہ دار

سٹینڈرڈ چارٹرڈ بینک، لاہور

PK55SCBL0000001212265001

تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ

برائے رابطہ

۹۱۔ بابر بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف

0306-4640366

مقالۂ خصوصی　　سید ابوالحسن علی ندویؒ

فریضۂ رمضان کی حکمتیں

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾[البقرہ۲:۱۸۳]

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں، جیسے تم سے پہلوں پر کیے گئے تھے، تاکہ شاید تم میں تقویٰ پیدا ہو۔''

اسلام اپنے پیروؤں کو جس اعتدال، ضبطِ نفس، اطاعت اور روحانیت کے کمال تک پہنچانا چاہتا ہے، اس کے لیے اس نے دو راستے اختیار کیے ہیں:

جو اشیاء اور اعمال انسان کی زندگی میں خود فراموشی، سخت بے اعتدالی، معصیت اور ارتکابِ جرم کی طرف طبعی میلان، پستی اور بے عملی کی طرف رجحان اور سرکشی کی رغبت، دنیا کی زندگی کی بڑھی ہوئی ہوس، تعیش و فسق و فجور کا بحران، بے حیائی اور بے غیرتی کی ترغیب پیدا کرتے ہیں، ان سب کو اس نے ابدی طور پر انسان کے لیے ممنوع قرار دے دیا۔ جس میں عمر کے کسی مرحلے اور زمانے کے کسی اختلاف اور ملک و مقام کے کسی امتیاز کو دخل نہیں ہے۔ ممنوعات کی اس فہرست میں وہ تمام معاصی داخل ہیں جو کبھی انسان کے لیے حلال اور جائز نہیں مثلاً شراب، لحم خنزیر، قمار، ربا، مال حرام اور دوسرے معاصی۔

جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا ہے، یا مسلمان سن بلوغ کو پہنچتا ہے تو وہ ان تمام چیزوں سے روزہ رکھ لیتا ہے۔ اس روزے کی ابتداء یا اس زندگی کی صبحِ صادق اسلام کے احکام کا مخاطب بن جانا ہے۔ اب اس روزے کا افطار عمر کے آفتاب کے غروب ہونے سے پہلے نہیں ہے۔ یہ ایک طویل روزہ ہے جو ہر مسلمان کو سفر و حضر میں رکھنا ہوتا ہے اور حالت اضطرار (شرعی) کے سوا کوئی استثناء نہیں۔ شریعت کے مقاصد کے حصول کے لیے اور ان معاصی کو بند کرنے کے لیے، جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے، یہ روزہ لازمی ہے۔

ان منصوص چیزوں کے علاوہ لذت کی تمام چیزیں (بشرطیکہ وہ حرمت و کراہت سے خالی

ہوں) مباح اور جائز ہیں، ان سے خواہ مخواہ کے لیے رکنا پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے اور ان حلال چیزوں کو اپنے لیے حرام کر لینا شریعت میں ایک طرح کی تحریف، دین میں تشدد اور کفرانِ نعمت قرار دیا گیا ہے۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان مباحات ولذائذ کا بے قید اور دائمی استعمال، لذتوں میں انہماک، اکل وشرب کی دائمی آزادی، اس جادۂ اعتدال سے انسان کو ہٹا دیتی ہے جس پر دین مسلمان کو دیکھنا چاہتا ہے، اس کے رجحانات اور مقاصدِ زندگی کو بدل دیتی ہے اور بعض اوقات نفس پروری، شکم پروری، ناؤنوش، اور بعیش کوش مقصودِ زندگی بن جاتا ہے۔ طبیعت میں ایک طرح کی بلادت اور بے حسی پیدا ہو جاتی ہے۔ ضبطِ نفس اور جفاکشی کی قوت باقی نہیں رہتی اور تن آسانی وتنعم کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانیت کی روح کچل جاتی ہے اور روحانی جذبات مردہ ہو جاتے ہیں۔ سالہا سال اور بعض اوقات پوری عمر، حقیقی روحانی مسرت، سبک روحی، دماغ کی یکسوئی، ذکر وعبادت میں لذت، مناجات کی حلاوت نصیب نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کو برسوں خالی پیٹ ہونے اور اعتدال کی سعادت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اس کا مزہ نہیں جانتے۔

اس اعتدال، ضبطِ نفس اور روحانیت کی قوت کو بڑھانے کے لیے دو راستے تھے: ایک تقلیلِ طعام کا راستہ تھا، لیکن اس میں دو نقص ہیں: ایک تو اس کا عمومی معیار اور سب کے لیے ایک مقدار مقرر کرنا نہایت مشکل ہے اور اس کو لوگوں کی رائے اور تمیز پر چھوڑنا بھی دشوار، کہ اوّل تو یہ اصولِ تشریع (قانون سازی) کے خلاف ہے، دوسرے مذاہب واخلاق کی تاریخ میں اس کا تجربہ ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ لوگوں نے اس آزادی اور اختیار کا ہمیشہ غلط استعمال کیا ہے اور مبہم اور غیر معین احکام عملاً بیکار و بے نتیجہ ہو کر رہ گئے (جیسے بہت سے اخلاقی نصائح اور ہدایات)، دوسرے اکثر محض تقلیلِ طعام بہت طبائع کے لیے بالکل غیر مؤثر اور بے نتیجہ تدبیر ہے۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ کوئی ایسا طویل وقفہ مقرر کیا جائے جس میں کوئی چیز استعمال نہ ہو۔ یہ طریقہ زیادہ حسی، زیادہ مؤثر اور قوت بہیمیہ کو زیادہ کمزور کرنے والا ہے۔ یہ وقفہ دین کی اصطلاح میں ''صوم'' یا روزہ ہے، جس کے خاص احکام وشرائط ہیں، جو بہت گہرے تشریعی اور نفسیاتی اسرار پر مشتمل اور حِکم ومصالح پر مبنی ہیں:

۱۔ روزہ صبح صادق سے شروع ہو کر غریب آفتاب تک رہتا ہے۔ اگر یہ وقفہ پورے دن

سے کم ہوتا تو اس کا کوئی خاص اثر شعور وطبیعت پر نہ پڑتا۔ زندگی میں ایسے اتفاق ہوتے رہتے ہیں کہ کئی کئی وقت کا کھانا ناغہ ہوجاتا ہے۔ اگر محض یہی ہو کہ دن میں صرف چند گھنٹوں کا روزہ رکھا جائے تو اس کا کوئی خاص احساس اور اصلاحی اثر نہ پڑے گا۔ اور بہت سے لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا اپنے حساب سے ایک روز ذرا دیر سے کھانا کھایا۔

۲۔ یہ روزے رمضان کے تیس یا انتیس دن رکھے جاتے ہیں، اس لیے کہ ایسے وقفے مسلسل ہوں، تاکہ ان کے نقوش دیرپا ہوں۔ ایک طویل وقفے سے یہ بہت زیادہ مفید ہے کہ متواتر متعدد متوسط درجے کے وقفے ہوں۔

۳۔ ان وقفوں کی تعداد کا تعین بھی ضروری ہے کہ اس کو مبہم اور غیر متعین چھوڑ دینے سے افراط وتفریط کا اندیشہ ہے۔ بہت سے لوگ بہت تھوڑے روزے رکھتے اور بہت سے لوگ بہت زیادہ روزے رکھتے۔ اور پھر جب یہ عالم گیر فریضہ ہے اور تشریعِ عام مقصود ہے تو اس میں انتخاب کا حق نہیں رہنا چاہیے تھا کہ جو شخص جس مہینے میں چاہے روزے رکھے۔ اس سے عام طور پر حیلہ جوئی، عذر اور بے عملی کا دروازہ کھلتا ہے اور گریز کی راہ پیدا ہوجاتی ہے۔ احتساب اور باز پرس کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ وعظ ونصیحت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ جس شخص سے بھی کسی وقت اس بارے میں گفتگو کی جائے وہ یہ کہہ کر منہ بند کرسکتا ہے کہ میرا معمول فلاں مہینہ میں ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ اس چیز کا رواج مٹ جائے گا۔

۴۔ ایک ہی وقت میں تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے روزہ رکھنے میں بڑی حکمت ہے۔ مسلمانوں کی بڑی جماعت کا فریضۂ صیام کو اہتمام کے ساتھ ایک وقت میں ادا کرنا، کمزور طبیعت والوں کے لیے بھی ہمت افزا، شوق انگیز اور فریضہ کی ادائیگی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ایک عالم گیر روحانی ماحول اور ایک عمومی دینی فضا پیدا ہوجاتی ہے، جو قلوب وارواح کے لیے موسم بہار کی تاثیر رکھتی ہے، جس میں تھوڑی توجہ سے ہر چیز میں نشوونما پیدا ہونے لگتی ہے۔ مسلمانوں کے اس روحانی فریضہ میں مشغول ہونے سے ملکوتی انوار وبرکات کا نزول ہوتا ہے اور عوام کے آئینہ دل پر انوار کا انعکاس ہوتا ہے۔ مسلمان دنیا کے جس گوشے میں بھی ہو، اس کو روزہ دارانہ فضا معلوم ہوتی ہے، جو اس سے خود ہی تقاضا کرتی ہے کہ وہ بھی روزہ دار ہو۔ مسلمان روزہ شکنی کرکے اپنے کو اس ماحول میں اجنبی اور ایک طرح کا مجرم سمجھتا ہے۔

۵۔ ان تمام حکمتوں کی بنا پر سال میں ایک پورا مہینہ روزہ کے لیے مخصوص کردیا گیا۔

دوسری خصوصیات کے علاوہ جن کا ہمیں علم نہیں، رمضان کی تخصیص کی ایک کھلی وجہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا اور روزہ اور قرآن میں خاص مناسبت ہے۔ قرآن چونکہ عالم غیب اور عالم روحانیت کی چیز ہے اور روزہ عالم مادی سے بہت حد تک آزادی، قلب وروح میں لطافت، اور عالم غیب اور عالم روح سے ایک طرح کی مناسبت پیدا کردیتا ہے۔ روزہ دار پر خدا کی صفات کا ایک پرتو اور اس کی شانِ صمدیت کا ایک اثر پیدا ہوجاتا ہے، اس لیے قرآن کے دل میں بسنے اور روح میں پیوست ہونے کا خاص موقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے حصے کو مختلف طریقوں سے روزہ میں زیادہ سے زیادہ داخل کیا گیا اور یہی تراویح کی حکمت ہے۔

۶۔ روزہ زندگی میں ایک ایسا محسوس فرق اور امتیاز پیدا کردیتا ہے کہ بے حس سے بے حس انسان کو بھی اپنے سابقہ طرزِ زندگی، غفلت شعاری، اور دنیاوی انہماک میں تخفیف کا طبعی تقاضا پیدا ہوجاتا ہے۔ رمضان ایک مہمیز کا کام دیتا ہے، جو سوئی ہوئی طبیعتوں کو جگانے، بجھے ہوئے دلوں کو گرمانے، آتش محبت کو بھڑکانے اور دبی چنگاریوں کو ابھارنے کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔ انسان کی فطرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تنوع اور اختلاف کو انسان کے بیدار اور ہوشیار کرنے اور اس کی کند طبیعت کو تیز کر دینے میں بڑا دخل ہے۔ رات دن کے اختلاف کو، انسان کی جسمانی وروحانی تازگی میں خاص دخل ہے۔

جس طرح سے کہ مادی طور پر رات دن کا اختلاف، ہر نئی صبح کا طلوع، انسان میں ایک شعور، ایک نئی آمادگی اور خالق کی طرف توجہ پیدا کردیتا ہے، اسی طرح روحانی طور پر رمضان کی سالانہ آمد، مسلمانوں کی بستیوں اور آبادیوں میں روحانیت کا احساس، دینی بیداری، اپنی کوتاہیوں پر ندامت، مجرموں میں اپنے جرائم پر ندامت اور خدا کی طرف ایک توجہ اور انابت پیدا کردیتی ہے۔ اور اگر مادیت نے قلب کو بالکل بے حس نہیں بنا دیا ہے تو صدہا آدمیوں کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوجاتی ہے۔ رمضان سالانہ احتساب اور اپنی سابق زندگی کا جائزہ لینے کا ایک بہترین موقع ہے۔ ہر شخص آسانی سے دیکھ سکتا ہے کہ اس نے گزشتہ رمضان سے اس رمضان تک کیسی زندگی گزاری ہے اور اس نے دینی حیثیت سے کہاں تک ترقی کی ہے؟

۷۔ رمضان ہر سال ہر شخص کو اپنی سطح سے ترقی دینے کے لیے آتا ہے۔ جو شخص جس سطح تک پہنچ گیا ہے، خواہ وہ سطح کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، اس سے بلند کرنے کی طاقت اس میں موجود

ہے۔ ہر شخص عمل، روحانیت، ذکر وعبادت، تعلق باللہ، اخلاص، جفاکشی ومجاہدہ، زہد وقناعت، ایثار، غمخواری اور مواساۃ کی جس منزل ومقام پر بھی ہے، ہر نیا رمضان اس کو اس سے آگے بڑھانے کے لیے اور زیادہ منزل کا شوق دلانے کے لیے آتا ہے۔ رمضان کی ساخت، رمضان کا نظام، رمضان کے اجزاء، رمضان کے مشاغل اور رمضان کا ماحول ایسا بنایا گیا ہے کہ ہر شخص کو اپنے کو ترقی دینے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ مادی موانع تقریباً دور ہوجاتے ہیں۔ ذکر وعبادت میں جذبۂ مسابقت پیدا ہوتا ہے۔ اچھے دینداروں اور روزہ داروں کا ساتھ ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مطالعہ کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے۔ قلب وروح میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ غرض وہ سارے مواقع بہم پہنچ جاتے ہیں جو انسان کی روحانی ترقی اور اصلاح کے لیے ضروری اور مفید ہیں اور ہر شخص کو اپنی سطح کے مطابق ترقی ہوتی ہے۔

۸۔ رمضان کے روزہ کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اطاعت الٰہی کا ایک کھلا ہوا مظہر ہے۔ اس سے بڑھ کر اطاعت کا ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ نعمتوں کی موجودگی میں اور ہر چیز کے استعمال کی قدرت کے باوجود، محض امتثالِ حکم کے لیے آدمی اپنے ہونٹوں پر قفل لگالیتا ہے۔ یہ قفل اللہ کے حکم ہی سے کھلتا ہے اور اللہ کے حکم سے لگتا ہے۔ جب نہ کھانے کا حکم ہوا اس وقت کھانا گناہ اور جب کھانے کا حکم ہوجائے تو اس وقت تعمیل ارشاد میں دیر کرنا غلطی ہے۔ اسی لیے آفتاب کے غروب ہوجانے کے بعد افطار کرنے میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

۹۔ روزہ میں جب وہ چیزیں بھی ممنوع ہوجاتی ہیں جو روزہ کے علاوہ ہمیشہ سے حلال وطیب ہیں اور روزہ کے بعد ہمیشہ حلال وطیب رہیں گی تو وہ چیزیں کیسے ممنوع نہ ہوں گی جو روزہ سے پہلے بھی حرام اور ممنوع تھیں اور روزہ کے بعد بھی حرام اور ممنوع ہوں گی، یعنی غیبت، لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، بے حیائی، جھوٹ۔ روزہ کی روح یہ ہے کہ تمام گناہوں سے اجتناب اور نفرت پیدا ہوا اور روزہ کے درمیان میں ان سے مکمل اجتناب ہو۔ اگر صرف نہ کھانے پینے سے روزہ رہا اور تقویٰ نہ پیدا ہوا تو ایک بے روح روزہ ہے جو صرف ڈھانچہ ہے، اس میں روح نہیں، اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: ''جس نے (روزہ میں) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو اللہ کو اس بات کی بالکل ضرورت نہیں کہ آدمی اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''
[رواہ ابوداؤد، رقم الحدیث: ۲۳۵۹]۔

فکرونظر

تحریک رجوع الی القرآن
رجوع الیٰ القرآن۔ضرورت،اہمیت اورطریق کار

ضرورت

ایک مسلمان کے لیے اہم ترین کام بلکہ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قرآن حکیم کو پڑھے، اسے سمجھے اوراس پر عمل کرے لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کی صرف آدھی آبادی قرآن مجید کو دیکھ کر یعنی ناظرہ پڑھ سکتی ہےاور جولوگ اس کی زبان جانتے اوراسے سمجھتے ہیں،ان کی تعداد ہمارے معاشرے میں شاید ایک فیصد بھی نہ ہو۔ یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ ہمارے دینی مدارس متخصص علماءتو تیار کرتے ہیں لیکن عوام کی دینی تعلیم وتربیت ان کے دائرہ کار میں نہیں آتی۔ اور جو قاری حضرات بچوں کو گھروں میں پڑھاتے ہیں یا مسجدوں میں بچوں کو قرآن سکھاتے ہیں،وہ ناظرہ پڑھا کر تعلیمی سلسلہ ختم کردیتے ہیں، بچوں کو ترجمہ نہیں سکھاتے۔ دوسری طرف قرآن حکیم کی تعلیم ہماری جدید تعلیم کا بھی باقاعدہ حصہ نہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کے اکثر افراد قرآن کے فہم سے عاری ہیں اور جب وہ جانتے ہی نہیں کہ اس کتاب مقدس میں کیا لکھا ہےتو وہ اس پر عمل کیا کریں گے؟

ہمارے ہاں یہ غلط فہمی بھی عام ہے کہ قرآن حکیم کو سمجھنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کے لیے عربی زبان آنی چاہیے اور معاشرے میں عربی زبان سکھانے کا کوئی معقول انتظام موجود نہیں ہے۔

فہم قرآن بذریعہ تدریس القرآن

ان حالات کو دیکھتے ہوئے تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ نے ۲۰۱۸ء میں قرآن حکیم کا اردو ترجمہ سکھانے کا ایک پیکیج تیار کیا جس میں اردو میں موجود عربی الفاظ کے استعمال کو بنیاد بنایا گیا، بار بار استعمال ہونے والے حروف اور ضمائر وغیرہ کو سرخ رنگ دیا گیا اور ایسی متعدد ٹیکنیکس استعمال کی گئیں جن کی مدد سے ایک طالب علم پندرہ منٹ روزانہ دے کر چار ماہ میں

ایک پارہ ختم کرسکتا ہے اور اس دوران اس میں اتنی قابلیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ باقی قرآن کا بھی ۷۰، ۸۰ فیصد حصہ بخوبی سمجھ سکتا ہے اور اس کا ترجمہ خود کرسکتا ہے۔ ہم نے اس طریق ترجمہ کو سارے مسالک کے ثقہ علماء کرام کو دکھایا اور ان کی تحریری تائید حاصل کی۔

ہم نے یہ تجربہ لاہور کے سکولوں میں کیا اور قرآن سکھانے والے اساتذہ کی ٹریننگ بھی کی اور اس سے بہت اچھے نتائج سامنے آئے۔ پچھلے سال ہمیں بعض اہل خیر کے تعاون سے لاہور کے ایک ہزار سکولوں تک تدریس القرآن کی بلا معاوضہ ترویج کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے تدریس القرآن کا ایک ایسا ایڈیشن بھی تیار کیا ہے جس سے گھروں میں بیٹھے خواتین وحضرات، ریٹائرڈ افراد اور بچیاں تدریس القرآن کے ذریعے قرآن حکیم کا اردو ترجمہ کرنے کا فن سیکھ سکتی ہیں۔

آپ کا تعاون درکار ہے

ہم چاہتے ہیں کہ پہلے لاہور، پھر پنجاب اور پھر پاکستان کے ہر سکول تک تدریس القرآن پہنچ جائے۔ اسی طرح ہماری خواہش ہے کہ ہر گھر تک تدریس القرآن پہنچ سکے تاکہ لوگ قرآن حکیم کو سمجھنا شروع کردیں، اس پر عمل کی خواہش ان کے اندر پیدا ہوجائے اور معاشرے میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا ہوجائے۔ لوگوں کی کردار سازی ہو اور بہترین انسان اور بہترین معاشرہ وجود میں آسکے۔

ظاہر ہے ہمیں اس کام کے لیے افرادی اور مالی قوت درکار ہے۔ اس لیے ہم ہر اس شخص سے یہ درخواست کرتے ہیں جس تک ہمارا یہ پیغام پہنچے کہ وہ اس نیک کام میں ہمارا ہاتھ بٹائے۔ خود قرآن کا ترجمہ کرنا سیکھے، دوسروں کو سکھائے، اہل وعیال کو اس پر آمادہ کرے۔ سکول کالج اسے اپنے ہاں رائج کریں۔ جو لوگ خود یہ نہ کرسکتے ہوں وہ ہمارے ٹرسٹ کی حسب توفیق مالی مدد کریں تاکہ ان کے اس صدقۂ جاریہ سے رجوع الی القرآن کی یہ تحریک معاشرے میں جڑ پکڑ لے اور اس کے تعمیری اثرات سے ہماری زندگیوں میں مثبت تبدیلی آسکے اور پاکستانی معاشرہ جنت نظیر بن سکے۔

اہمیت

سب مسلمان قرآن حکیم کی اہمیت سے واقف ہیں اور اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یہ وہ ہدایت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اتارا تاکہ وہ اس نور کو ساری دنیا تک پھیلا دیں۔ ساری امت اس پر بھی متفق ہے کہ قرآن دین و دنیا میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہمارے اسلاف نے دین و دنیا میں جو کامیابی حاصل کی اس کی وجہ ان کا قرآن سے جڑ جانا اور اس پر عمل کرنا تھا اور ہم اگر آج دنیا میں ذلیل و خوار اور رسوا ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ بقول اقبال ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور 'ہم' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

خود نبی کریم ﷺ کی یہ حالت تھی کہ آپ چلتا پھرتا قرآن تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ آپ ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟ تو آپ نے جواب دیا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ گویا آپ مجسم قرآن تھے۔ خود قرآن گواہی دیتا ہے کہ آپ رات کا اکثر حصہ کھڑے ہو کر قرآن کی تلاوت فرماتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے پیر مبارک سوج جاتے۔ یہی ذوق صحابہ کرامؓ میں بھی منتقل ہوا کہ ان کا دن رات کا بہت سا حصہ قرآن کی تلاوت میں گزرتا۔ وہ قرآن پر غور بھی کرتے اور اس پر عمل بھی کرتے۔ یہی ان کی اس قوت کا منبع تھا جس کے آگے دو دہائیوں سے بھی کم عرصے میں اس وقت کی دنیا کی دو سپر پاورز ان کے قدموں میں تھیں۔

لہٰذا ہماری دنیا و آخرت میں کامیابی کا انحصار قرآن کریم سے ہماری وابستگی پر اور اس پر عمل کرنے میں ہے لہٰذا ہمیں اسے سمجھنے کے لیے وقت نکالنا چاہیے اور اس پر عمل کا مصمم ارادہ کر لینا چاہیے۔

تعلیم و تربیت　　ڈاکٹر محمد امین

اسلامی تہذیب کے احیاء میں تعلیم کا کردار

تنظیم اساتذہ پاکستان کی نویں قومی تعلیمی کانفرنس سے مدیر البرہان کا آن لائن خطاب

میں تنظیم اساتذہ کی قیادت کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اتنے اہم موضوع کو اپنی نویں قومی تعلیمی کانفرنس کا موضوع بنایا اور لوگوں کو اس موضوع پر سوچنے، غور کرنے اور گفتگو کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اس موضوع پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس عنوان میں موجود اہم الفاظ تہذیب، تعلیم اور احیاء کے مفہوم پر غور کر لیا جائے۔

'تہذیب' سے مراد ہے فکر کا عمل میں ڈھلنا۔ عقائد و نظریات کا انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کی صورت اختیار کرنا۔ نظریۂ حیات کا نظامِ حیات میں تبدیل ہونا اور فکر کا تمدنی اوضاع میں تبدیل ہونا۔

'تعلیم' سے مراد ہے تعلّم، تحقیق اور تربیت۔ تعلّم یعنی ابلاغِ علم بذریعہ تدریس۔ تحقیق سے مراد ہے عملِ تعلیم میں جستجو، اجتہاد اور ابتکار۔ اور تربیت سے مراد ہے تعلیم کا عمل میں ڈھلنا یعنی تعلیم اس طرح دینا کہ وہ انسان کا عمل اور عادت بن جائے۔ قرآن اسے تزکیۂ نفس سے تعبیر کرتا ہے یعنی نفس کی ایسی تربیت کہ جو اس نے جانا ہے وہ اس پر عمل کرنے پر قادر ہو جائے۔

'احیاء' سے مراد اس تلخ حقیقت اور امر واقعی کو تسلیم کرنا ہے کہ اسلامی تہذیب اس وقت اپنی مکمل شکل میں مجسم نہیں، غالب نہیں بلکہ متروک ہو چکی، شکست کھا چکی اور مغلوب ہو چکی اور اسے از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے عربی میں نشأۃ ثانیہ اور انگریزی میں رینے سان (Renaissance یا Re-birth) کہتے ہیں۔

جب ہم اسلامی تہذیب کے احیاء کی بات کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ یہ دوبارہ زندہ ہو جائے، غالب آ جائے تو ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ یہ زوال پذیر کیوں ہو گئی؟ وہ کون سے عوامل

اور اسباب تھے کہ یہ زوال پذیر ہوگئی۔ اور جب ہم زوال کے اسباب پر غور کریں تو منطقی طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اسے عروج کیوں کر حاصل ہوا؟ کیونکہ عقل عام اس کا تقاضا کرتی ہے کہ جن محرکات اور عوامل سے اسے عروج ملا، ان کے فقدان ہی سے یہ زوال پذیر ہوئی لہٰذا اسلامی تہذیب کے زوال کے اسباب پر غور کرتے ہوئے ہمیں مزید پیچھے جا کر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے عروج کے اسباب کیا تھے۔ گویا ہمارے سامنے تین امور ہیں:

۱۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل و تدوین کیسے ہوئی؟ یہ غالب کیسے ہوئی؟ اس کی تشکیل کے اصول کیا تھے اور اس کے غلبے کا منہاج کیا تھا؟

۲۔ ان اصولوں اور منہاج کو چھوڑا تو وہ زوال پذیر ہوئی

۳۔ مسلمان ان اصولوں کو دوبارہ اپنائیں گے تو اسلامی تہذیب کا احیاء ممکن ہوگا

اسلامی تہذیب کی تشکیل اور غلبہ

آیئے اس پر غور کریں کہ اسلامی تہذیب وجود میں کیسے آئی؟ غالب کیونکر ہوئی؟ اس کا پروسیس اور منہاج کیا تھا؟

۔ اس پروسیس کا ستون اور اس کی بنیاد تھا اس کے عقائد و نظریات اور نظریۂ حیات پر مسلمانوں کا پختہ اور گہرا یقین جسے ہم ایمان کہتے ہیں۔ یہی انسانی زندگی (انفرادی اور اجتماعی دونوں) کا محرک اولین ہے، محرک اساسی ہے، منبع حرکت و قوت ہے۔

۔ ایمان کیسے پیدا ہوتا ہے اور کیسے قوی ہوتا ہے؟ تعلیم و تزکیہ سے۔ یہ ہم نہیں کہتے، قرآن کہتا ہے کہ ازل سے دستور الٰہی یہی ہے کہ وہ انبیاء کو معبوث کرتا ہے تو یہی منہج دے کر کہ وہ دعوت و اصلاح اور تعلیم و تزکیہ کا کام کریں تا کہ لوگ ایمان لائیں اور اعمال صالحہ پر قادر ہو سکیں۔

۔ سورۃ الاعلیٰ میں ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝﴾ [الاعلیٰ ۸۷: ۱۴ تا ۱۹]

”بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا

اور نماز پڑھتا رہا، مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو، حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے، یہ بات پہلے صحیفوں میں (مرقوم) ہے، (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

- اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا: ﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝﴾ [طٰہٰ ۲۰: ۴۳، ۴۴]

''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو رہا ہے، اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔''

اور النازعات میں فرمایا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝﴾ [النازعات ۷۹: ۱۷ تا ۱۹]

''(اور حکم دیا) کہ فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو رہا ہے، اور (اس سے) کہو کہ کیا تو چاہتا ہے کہ اپنا تزکیہ کرلے؟ اور میں تجھے تیرے پروردگار کا رستہ بتاؤں تاکہ تجھ کو خوف (پیدا) ہو۔''

- حضرت ھود علیہ السلام کی زبان سے فرمایا: ﴿اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ﴾ [ھود ۱۱: ۸۸]

''مَیں تو جہاں تک مجھ سے ہو سکے (تمہارے معاملات کی) اصلاح چاہتا ہوں۔''

- حضرت ابراہیم علیہ السلام جب کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو دعا فرمائی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ [البقرہ ۲: ۱۲۹]

''اے پروردگار، ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔''

- اور جب آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرمایا تو کام کرنے کا جو پیکیج دیا، جو فارمولا عطا کیا، وہ تھا:

﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾[البقرہ۲:۱۵۱]

''جس طرح ہم نے تم میں تمہی میں سے ایک رسول بھیجے ہیں جو تم کو ہماری آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے، تمہارا تزکیہ کرتے اور کتاب (یعنی قرآن) اور دانائی سکھاتے ہیں، اور ایسی باتیں بتاتے ہیں، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔''

یہی بات سورۃ آل عمران اور سورۃ الجمعہ میں فرمائی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں ۱۳ سال تک صحابہ کرام کو تعلیم دی، ان کا تزکیہ کیا اور وہ افراد تیار کیے جو قرآن کو مطلوب تھے۔ان کی حالت یہ تھی کہ نماز میں فرشتے نے آپ ﷺ کو بتایا کہ آپ کے جوتے صاف نہیں ہیں تو آپ نے جوتے اتار دیئے (یہ اس وقت کی بات ہے جب ابتداء میں جوتوں سمیت نماز پڑھنے کی اجازت تھی) تو سارے مسلمانوں نے جوتے اتار دیے۔حرمتِ شراب کا حکم نازل ہوا تو شراب پانی کی طرح مدینہ کی گلیوں میں بہنے لگی۔ بدر میں مسلمان قلیل اور کمزور تھے اور جان کا خطرہ سامنے تھا لیکن جب آپ ﷺ نے قتال کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ کیا تو انصار نے کہا: یا رسول اللہ! ہم قوم موسیٰؑ کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ جاؤ جا کر تم لڑو اور تمہارا خدا لڑے بلکہ ہم آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔آپ پر ہماری جان قربان، ہم آپ کے شانہ بشانہ خون بہائیں گے۔اور صلح حدیبیہ کا واقعہ جب کفار کے سفیر نے قریش کو جا کر کہا کہ اے اہل مکہ! محمد (ﷺ) سے لڑنے کا خیال چھوڑ دو کیونکہ اس کے متبعین کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اس کا تھوک اور بال بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے اور انہیں برکت کے لیے لپک کر ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔

غرض ان تربیت یافتہ افراد سے آپ ﷺ نے مدینہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم کی اور اسلامی تہذیب اگلے ۱۲۰۰ سال تک میرٹ پر غالب رہی اور اس وقت کی معلوم دنیا کے بڑے حصے پر مسلمانوں نے حکومت کی۔

۔ مسلمانوں نے تعلیم وتزکیۂ نفس کے نظام کو وسعت دی۔تعلیم پرائیویٹ سیکٹر میں علماء کرام کے ہاتھوں میں تھی اور لوگوں کے تزکیہ کے لیے خانقاہیں اور رباطیں قائم کی گئیں۔

اسلامی تہذیب کے غلبے کا یہ اثر تھا کہ مسلمانوں نے یونان کے علمی حملے کو پسپا کیا اور منگولوں کے عسکری حملے کے بعد اپنی شکست کو فتح میں بدل ڈالا۔

اسلامی تہذیب زوال پذیر کیوں ہوئی؟

اسلامی تہذیب اس لیے زوال پذیر ہوئی کہ بتدریج تعلیم وتزکیہ کا نظام غیر مؤثر ہو گیا، ایمان کمزور ہو گئے اور اعمالِ صالحہ باقی نہ رہے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لیجیے ایک یہ کہ تعلیم وتزکیہ سے کیا مراد ہے؟ اور دوسرے یہ کہ تعلیم وتزکیہ سے ہوتا کیا ہے؟ قرآن حکیم میں نبی کریم ﷺ کے لیے کارِ نبوت کے طور پر چار امور کا ذکر ہوا ہے۔ تلاوتِ کتاب، تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیۂ نفس۔ تلاوتِ کتاب تو تعلیم کتاب ہی کا حصہ ہے گویا تعلیمِ قرآن سے مراد ہے قرآن حکیم کا پڑھنا، اس کا سمجھنا، اس پر عمل کرنا اور اسے دوسروں تک پہنچانا۔ تعلیمِ حکمت سے مراد یہ ہے کہ عقلی علوم اور امور بھی قرآن حکیم کے اتباع میں سرانجام دینا اور تعلیمِ قرآن و تعلیمِ حکمت کا نتیجہ ہونا چاہیے تزکیۂ نفس۔ تزکیۂ نفس سے مراد ہے نفس انسانی کی ایسی تہذیب، ایسی تربیت کہ تعلیم کتاب وحکمت اس کا عمل بن جائے، اس کے لیے دینی تعلیمات پر عمل سہل ہو جائے بلکہ یہ اسے طبعاً مرغوب ہو جائے اور شریعت اس کی طبیعت بن جائے۔

اب اگلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ تعلیم وتزکیہ سے ہوتا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ جب انسان کسی علم/ نظریے/عقیدے پر دل وجان سے ایمان لاتا ہے، اس سے ذہنی وقلبی طور پر وابستہ ہو جاتا ہے اور اس پر یکسو ہو جاتا ہے تو اس سے عمل کی تحریک پیدا ہوتی ہے اور انسانی صلاحیتیں نمو پانے لگتی ہیں جنہیں ہم بنیادی انسانی اخلاق بھی کہہ سکتے ہیں جیسے محنت کی عادت، نظم وضبط، تنظیم، اطاعتِ قانون، ایثار وقربانی کا جذبہ، اطاعتِ امیر وغیرہ۔ یہ وہ قوتیں ہیں جو دنیا میں قطعِ اسباب کے لیے ضروری ہیں۔

قرآن حکیم کی رو سے قوموں کے عروج وزوال کا یہی فلسفہ ہے کہ جو قوم بھی اپنے نظریۂ حیات سے شدید وابستگی اختیار کرتی ہے وہ قطع اسباب کی اہل ہو جاتی ہے خواہ اس کا نظریۂ حیات جو بھی ہو۔ اسی لیے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

وفا داری بشرط استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اگر کوئی قوم اللہ پر یقین رکھتی ہو اور اس ہدایت پر عمل کرے جو انبیاء لے کر نازل ہوتے ہیں تو ایمان عمل صالح میں ڈھل جاتا ہے اور مسلمان قوم میں وہ صلاحیتیں ابھر آتی ہیں جو دنیا میں قطع اسباب کے لیے ضروری ہوتی ہیں یوں اسلامی تہذیب تشکیل پاتی اور غالب آتی ہے لیکن اگر مسلمان اس دین پر حقیقی طور پر عمل نہ کریں جس پر ایمان کا وہ دعویٰ کرتے ہیں تو وہ کمزوری اور نکبت کا شکار ہو جائیں گے اور وہ قوم دنیا پر غالب آجائے گی جو اپنے نظریات سے شدید وابستگی رکھتی ہو اور اس کے لیے محنت و ایثار کرنے والی ہو، خواہ اس کے نظریات خلافِ اسلام ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ قرآن کا ایک جنیریک (Generac) فارمولا ہے قوموں کے عروج و زوال کا۔

تو خلاصہ یہ کہ مسلمان جب اپنے نظریۂ حیات سے جڑ گئے، محکم طور پر اس سے وابستہ ہو گئے تو ان کی صلاحیتیں نمو پانے لگیں، وہ طاقتور ہو گئے اور کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا اور جب انہوں نے اپنے نظریۂ حیات پر عمل چھوڑ دیا، اس سے ان کی وابستگی کمزور ہو گئی اور وہ محرک عمل نہ رہی تو ان سے قوت عمل بھی سلب ہو گئی۔ اس کمزوری کا سبب ضعف ایمان تھا اور ضعف ایمان کا سبب نظام تعلیم و تزکیۂ نفس کا غیر مؤثر ہو جانا تھا۔ وہ لوگ غلط ہیں جو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب مادی وسائل کی کمی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ جانا ہے جیسا کہ اقبال کہتے ہیں کہ۔

سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

علامہ اقبال نے مسلم زوال کے اسباب تین گنوائے ہیں اور کہا ہے کہ۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری!

یعنی مسلمانوں کے زوال کا سبب ہے غیر مؤثر نظام تعلیم اور علم کا جمود (مسلم عروج کے بارہ سو سال میں تعلیم علماء کرام کے ہاتھ میں اور پرائیویٹ سیکٹر میں تھی)۔ اور پیری سے مراد

ہے تزکیۂ نفس کے نظام کا غیر مؤثر ہو جانا اور تزکیہ کے ادارے تصوف میں غیر اسلامی افکار اور رسوم و رواج کا در آنا۔ اور زوال کی تیسری وجہ ہے سیاسی عدم استحکام اور ملوکیت۔

خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ہے ضعف ایمان اور اعمال صالحہ کا فقدان۔ اور ایمان کی کمزوری کا سبب ہے غلط اور غیر مؤثر، غیر اسلامی نظام تعلیم و تربیت اور نظام تزکیۂ نفس۔

اسلامی تہذیب کے احیاء کا منہج

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسلم تہذیب کے زوال کا سبب غلط، غیر مؤثر اور غیر اسلامی نظام تعلیم و تربیت ہے اور اس کے احیاء کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم و تربیت کو اسلام کے مطابق بنائیں اور اسے مؤثر بنائیں۔ اس کے لیے ہمیں کن اقدامات کی ضرورت ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آج کے نظام تعلیم کا جائزہ لے لیں۔

- ہمارا نظام تعلیم اصولاً آج بھی وہی ہے جو دورِ غلامی میں لارڈ میکالے نے تجویز کیا تھا اور جس کے پیش نظر ایک غلام نسل تیار کرنا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جن لوگوں کے پاس بھی امام اقتدار رہی کسی نے اس نظام تعلیم کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل نو کی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ آج بھی مغرب کے فکری اور عملی غلام پیدا کر رہا ہے۔

- نظام تعلیم و تربیت کے غلط اور صحیح ہونے کا معیار ہمیں قرآن دیتا ہے "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ" آج پاکستان کو دیکھ لیجیے۔ قرآن کی تعلیم نظام تعلیم کا حصہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ صرف ملک کی آدھی آبادی ناظرہ قرآن پڑھ سکتی ہے۔ قرآن کو اس کی زبان میں سمجھنے والے شاید ایک فیصد بھی نہیں۔ جو ترجمہ وغیرہ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں۔ اور جب ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں، اس کی زبان سے ہی نا واقف ہیں تو اس پر عمل کیا کریں گے؟

علومِ حکمت خصوصاً ان عمرانی علوم (Social Sciences) کو دیکھیے جو پاکستانی

سکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھائے جارہے ہیں وہ سوفیصد مغربی فکروتہذیب پر مبنی ہیں نیز یہ بھی دیکھیے کہ مغرب کی الحادی فکروتہذیب کا تنقیدی مطالعہ ہمارے نصاب کا حصہ ہی نہیں تو کہاں سے آئے گی صدائے لا الہ الا اللہ؟ اپنے نظام تربیت کا جائزہ لے لیجیے تو اس میں اسلام نام کی حد تک بھی شامل نہیں اور ہم اپنی درسگاہوں میں الحاد وتشکیک کے مارے دو ٹانگوں کے جانور پیدا کررہے ہیں جو اسلامی افکار وتعلیمات پر یکسو ہی نہیں اور نہ کوئی ان کی اسلامی تربیت کرنے والا ہے۔

لہٰذا ہم اگر اسلامی تہذیب کا احیاء چاہتے ہیں تو:

۱۔ نظامِ تعلیم میں قرآن حکیم کو بنیادی اہمیت دینا

۲۔ سوشل سائنسز اور نیچرل سائنسز کو قرآنی تناظر میں پڑھانا ہوگا۔

۳۔ نظام تربیت وتزکیہ کو قرآن کے مطابق بنانا ہوگا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ان باتوں کی کسی کو فکر نہیں۔علماء کرام اور دین کے علمبرداروں کو بھی اس کی فکر نہیں۔تحریک اسلامی اور تنظیم اساتذہ سے وابستہ لوگوں کے تعلیمی اداروں میں بھی نظام تعلیم وتربیت اسلامی نہیں تو اسلامی تہذیب کا احیاء کیسے ہوگا؟ ہم مغربی تہذیب کی پیروی کررہے ہیں۔بچوں کو مغربی تہذیب کی پیروی سکھارہے ہیں۔تحریکی لوگوں کے پاس ہزاروں سکول، سیکڑوں کالج اور کئی یونیورسٹیاں ہیں لیکن کسی میں اسلامی تعلیم وتربیت کا نظام موجود نہیں۔سید مودودی علیہ الرحمۃ نے کہا تھا کہ اسلام کی بجائے مغربی فکروتہذیب کی تعلیم دینے والے یہ تعلیمی ادارے درسگاہیں نہیں قتل گاہیں ہیں۔اور جب انہوں نے یہ الفاظ کہے تو وضاحت کی کہ میں کوئی جذباتی آدمی نہیں سنجیدہ اور ذمہ دار آدمی ہوں اور سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ یہ درسگاہیں نہیں قتل گاہیں ہیں۔افسوس کہ آج انہی مولانا مودودی کی تحریک سے وابستہ لوگ یہ درس گاہیں بلکہ قتل گاہیں چلارہے ہیں۔لہٰذا ہمیں احتساب نفس کی ضرورت ہے، اپنی اصلاح کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ ہمیں دین کو سمجھنے، اس پر عمل کرنے اور تعلیم وتزکیہ کے ذریعے اسلامی تہذیب کے احیاء کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العلمین

تعلیم و تربیت

حافظ عمران طحاوی

یونیورسٹیوں کا حیا باختہ ماحول

لمز (LUMS) لاہور میں فرضی شادی کا ڈرامہ

ہمارے تعلیمی نظام و نصاب کے غیر اسلامی ہونے کا رونا تو ایک طرف نسلِ نو مخلوط تعلیم کی بدولت حیا اور غیرت کا جس طرح سے جنازہ نکال رہی ہے وہ نہایت پریشان کن ہے۔ تعلیم جو ہمیشہ سے ہماری علمی تاریخ میں اقدار کے فروغ میں کردار ادا کرتی چلی آئی ہے اب محض ایک کاروبار بن کر رہ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تعلیمی ادارے روح سے خالی ہو گئے ہوں ہو تو طلبہ کتنے ثمر آور ہوں گے۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اکبر الٰہ آبادی نے ایک صدی قبل جو رونا رویا اُسے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مخلوط تعلیم کے گونا گوں ثمرات کا نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں لمز یونیورسٹی لاہور میں بالی وڈ ڈے کو پروموٹ کرنے کے لیے نکاح جیسے پاکیزہ بندھن کو ''فرضی شادی'' میں ڈراماٹائیز کر کے تین دن تک منایا جاتا رہا۔ جس کو بھارت میں انڈیا ٹائمز سمیت مختلف میڈیاز پر سراہا گیا کیونکہ ان تینوں دن ان کی ثقافت ہی پروموٹ ہو رہی تھی۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

اس تقریب میں ہلڑبازی، کن اکھیوں کے اشارے اور آوازے کسنا واضح دیکھا گیا۔ مایوں، تیل، مہندی کی تقریب میں مخلوط ناچ گانے کا اہتمام ہوا۔ یہ تمام حرکتیں حیا باختہ تھیں۔ آج اگر ثقافت کے نام پر فرضی شادی ہو سکتی ہے تو کل کیا کیا ہوگا؟

تعلیم جو کبھی تربیت ہوتی تھی آج محض ڈگری کے حصول اور معاشقوں تک محدود ہو گئی ہے۔ درسگاہیں رجال سازی کی بجائے ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لیے ملازم تیار کرتی ہیں۔ ظاہر ہے اس مشینی تحریک کا انجام بھی مشینی ہی ہوگا نہ کہ اخلاقی۔ بچے اگر اپنے والدین اور مذہب

سے بیزار ہیں تو یہ اس خدا گریز تعلیم کا نتیجہ ہے جس میں خدا کی مرضی کی بجائے انسان کی ذاتی خواہش کی تسکین ضروری ہو گئی ہے۔ چھچھوری حرکتیں فیشن بنتی جا رہی ہیں اور فیشن اپنے جلوے جگہ جگہ دکھا رہا ہے۔

حیا اسلام کا حسن اور طرہ امتیاز ہے۔ حیا دل کی وہ کیفیت ہے جس میں انسان کچھ برا کہتے ہوئے یا کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے، اسی لیے حیا کو ایمان کا حصہ کہا گیا ہے۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: بے شک ہر دین کا ایک خُلق ہوتا ہے اور اسلام کا خُلق شرم و حیاء ہے۔ کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور دین اسلام کا امتیازی وصف حیاء ہے۔ اسی لیے منہ پھٹ اور گناہوں پر دلیر شخص کو ہماری تہذیب میں بے حیا اور بے شرم کہا جاتا ہے جبکہ مغرب والے اسے Bold کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''حیا'' ایمان کا ایک بنیادی شعبہ ہے۔ اسی بنیاد پر فرمایا گیا: جب تم حیا کو کھو دو، تو جو چاہے کرو۔ یعنی انسانی زندگی سے اگر شرم و حیا معدوم ہو جائے تو ایسی زندگی کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ اس لیے کہ شرم و حیا اسلامی معاشرے کے لازمی جزو ہیں۔ اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلم معاشرہ برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم رکھتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے، جو اس کی اللہ کے خوف سے حفاظت کرے، تو اللہ اس کے عوض اسے ایسا ایمان عطا کرے گا جس کی مٹھاس وہ اپنے دل میں محسوس کرے گا۔ (الترغیب والترہیب: ۳/ ۲۴)

قرآن و حدیث میں فحاشی کی بنیاد یعنی آنکھ کی بے احتیاطی کو سختی سے قابو میں رکھنے کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ ایسی بنیاد ہے کہ اگر صرف اس پر ہی قابو پا لیا جائے تو ساری بے حیائیاں دنیا سے رخصت ہو سکتی ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اے نبی! مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔'' اے نبی! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں''۔ (سورة النور) ۔سورۂ احزاب میں مومن عورتوں سے خطاب میں ارشاد فرمایا گیا: تم اپنے گھروں کے اندر رہو اور بے پردہ ہو کر باہر نہ نکلو جس طرح پہلے زمانے کے دورِ جاہلیت میں عورتیں بے پردہ باہر نکل کر گھومتی پھرتی تھیں۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہماری نسل نو کو شیطان کے شر سے بچائے اور ہدایت عطا فرمائے۔

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

نیشنل کریکلم کونسل کے ثانوی و اعلیٰ ثانوی جماعتوں کے مارچ ۲۰۲۳ء کے اردو اور انگریزی کے

مجوزہ قومی نصاب کا ایک جائزہ

حال ہی میں نیشنل کریکولم کونسل (NCC) اسلام آباد میں LUMS سے امپورٹڈ ڈائریکٹر ڈاکٹر مریم چغتائی اور این جی اوز کی طرف سے سپانسر کردہ ماہرین (Consultants) نے گریڈ 9 تا 12 تک کے جملہ مضامین کے نصاب کا نیا مسودہ جاری کیا ہے۔ سطور ذیل میں ہم نے اس کے اردو اور انگریزی کے نصاب کا ابتدائی جائزہ لیا ہے۔

اردو کا نصاب

اس سے پہلے ملک میں 2006ء کا قومی نصاب رائج تھا۔ ہم نے 2023ء کے اردو نصاب نہم دہم کا موازنہ 2006ء کے اردو نہم دہم کے نصاب سے کیا ہے۔

اردو زبان کے قواعد و ضوابط دس بیس سالوں میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔ تاہم کسی بھی زبان کو سکھاتے وقت ہم جن مضامین یا عبارات کو درسی کتب میں شامل کرتے ہیں ان سے طلبہ کو ایک پیغام ملتا ہے جو آئندہ زندگی میں ان کے خیالات اور طرز عمل کو متاثر کرتا ہے۔

اردو اور انگریزی کے نصاب کے آخر میں اسباق یا عبارات کے موضوعات کی فہرست دی جاتی ہے جو درسی کتب لکھنے والوں کی رہنمائی کے لیے ہوتی ہے۔

ہم نے 2006ء کے نصاب اردو کے مجوزہ موضوعات اور 2023ء کے مجوزہ موضوعات کا موازنہ کیا ہے جس سے چند حیران کن نکات سامنے آتے ہیں:

* 2006ء کے اردو کے نصاب میں علامہ اقبال کی اتحاد اسلامی پر نظم اور حفیظ جالندھری کی اسلام اور مشاہیر پر نظم اور احسان دانش کی حب وطن پر نظم تھی۔ یہ تینوں اب نصاب کی فہرست موضوعات میں شامل نہیں۔

* علامہ اقبال کی کوئی نظم شامل نہیں البتہ مکتوب کی کیٹا گری میں ان کا اپنے استاد نور احمد کے نام خط شامل ہے۔

* 2006ء کے نصاب میں جمیل الدین عالی کا قومی نغمہ نصاب میں شامل تھا جسے نکال دیا گیا ہے۔اس کی جگہ نہم دہم میں مزید غزلیں شامل کردی گئی ہیں۔

نیشنل کریکولم کونسل اسلام آباد میں غیر ملکی این جی اوز کے سپانسر کردہ لبرل ماہرین کو یہ ٹاسک دیا جاتا ہے کہ سوشل سائنسز کے مختلف مضامین کی درسی کتب سے اسلام، نظریہ پاکستان اور ہماری معاشرت و اخلاقی اقدار سے متعلقہ نکات کو یا تو نکال دیا جائے یا انہیں کمزور کردیا جائے۔ عیسائی مشنریز بھی اس سازش میں شریک ہیں۔ انہوں نے اردو اور انگریزی کی درسی کتب سے اسلام کی اخلاقی اقدار اور تاریخی حوالوں کو نکلوانے کے لیے سپریم کورٹ میں اپیل بھی دائر کر رکھی ہے۔

ملک کے مختلف صوبوں میں موجود ماہرین تعلیم کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ آنکھیں کھلی رکھیں اور یہ جائزہ لیتے رہیں کہ اسلام آباد میں مٹھی بھر لوگ کیا سازشیں کر رہے ہیں اور یہ کہ صوبوں کے شعبہ ہائے نصاب و نصابی کتب میں تعینات ماہرین تعلیم ان سازشوں کے سدباب کے لیے ضروری اقدامات کریں۔

انگریزی نصاب

انگریزی نصاب کی بڑی خرابیاں یہ ہیں:

- اس میں جو ناول، افسانے اور نظمیں دی گئی ہیں وہ اکثر و بیشتر مغربی مصنفین کی ہیں جن میں یورپی تہذیب وثقافت کی عکاسی کی گئی ہے جو ظاہر ہے اسلامی اور پاکستانی تناظر سے مطابقت نہیں رکھتی اور فکری انتشار کو جنم دے گی۔

اسی طرح اس نصاب میں جو مواد دیا گیا ہے وہ ادبی، علمی اور لٹریری نوعیت کا ہے اور اس کی زبان مشکل ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زیادہ طلبہ انگریزی کے مضمون میں فیل ہوں گے جبکہ پہلے ہی میٹرک کے امتحان میں جو طلبہ فیل ہوتے ہیں، ان کی اکثریت انگریزی میں فیل ہوتی ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارے طلبہ کی بنیادی ضرورت روزمرہ میں استعمال ہونے والی فنکشنل انگلش کی ہے نہ کہ لٹریری انگلش کی کیونکہ بہت کم طلبہ انگلش لٹریچر میں تخصص کی طرف جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا تجزیے کو سامنے رکھتے ہوتے اب NCC کے مجوزہ انگریزی نصاب کا جائزہ لیں:

۱۔ نویں دسویں کے نصاب میں جن نظموں، افسانوں اور جن مغربی مصنفین اور شعراء کو جگہ دی گئی ہے وہ یہ ہیں:

- Rudyard Kipling - Robert Olen Butler -Margaret Mead
- George Orwell (Animal Farm) - The Gift of Maggie

۲۔ گیارہویں بارہویں میں جن شعراء، مصنفین اور جن نظموں، افسانوں اور ناولوں کو جگہ دی گئی ہے وہ یہ ہیں:

-Lady Lazarus' by Sylvia Plath -'Still I Rise' by Alice Walker -'Hurricane hits England' by Grace Nichols 'Anne Hathaway' by Carol Ann Duffy -Growing old by Matthew Arnold - An afternoon nap by Arthur Yap -Things Fall Apart by Chinua Achebe -Songs of ourselves (Poetry Anthology -The lost woman -Strong winds -Father returning home -Before Sunrise

۳۔ لسانیات کے نصاب میں سٹینڈرڈ پریکٹس یہ ہے کہ نصابی کتب کی تدوین کے لیے نصاب میں موضوعات اور تصورات (Themes and sub-themes) کی فہرست دے دی جاتی ہے تا کہ مصنفین ان کو سامنے رکھتے ہوئے نصابی کتب مدون کر سکیں لیکن مارچ ۲۰۲۳ء کے اس مجوزہ نصاب میں انگریزی کے لیے یہ طریقہ اپنانے کی بجائے غیر ملکی مصنفین اور ان کی نظموں، ناولوں اور افسانوں کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اس سے دو نقصان ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ نصابی کتب کے مدون کرنے والوں کے لیے کام اور سکوپ کم ہو جائے گا اور دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب و ثقافت اور ان کے اصول و اقدار جبراً جزو نصاب و نصابی کتب رہیں گے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ نئے نصاب میں کن تصورات کو جگہ دی گئی ہے اور ان تصورات کا پرانے ۲۰۰۶ء کے نصاب سے تقابلی مطالعہ کر کے دیکھتے ہیں کہ نئے نصاب میں کن تصورات کو دیس نکالا دے دیا گیا ہے:

i۔ نئے نصاب کے موضوعات و تصورات

1.Entrepreneurship 2.Digital Globalization 3.Digital Media 4.SDG-Millennium Development Goals (including UPE, Gender Equality and Child Health) 5.Innovation and Creativity 6.Clean water & sanitation 7.Drug Education 8.Soft Skills 9.Nature and natural resources 10.Travel and Tourism 11.Literature 12.Poetry

ii۔ ۲۰۰۶ء کے نصابات کے موضوعات وتصورات

1.Peaceful Coexistence/Peace Education/Inclusive Education 2.Self, People, and Places 3.Patriotism / National Pride 4.Nature 5.Gender Equality 6.Festivals and Cultural Events 7.Role Models, Male / Female (Past /Present) 8.Environmental Education 9.Population Education 10.Travel and Transport 11.Technology 12.Education and Employment (Careers / Occupations) 13.Dignity of Labor 14.Media 15.Crisis Awareness and Management 16.Participatory Citizenship 17.Health, Safety, Drug Education 18.Life Skills Education

iii۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ (PCTB) کے ۲۰۱۹ء کے نصاب کے اعلیٰ ثانوی کے لیے موضوعات وتصورات

1.Ethics and values (Moral character in accordance with rules of right and wrong) 2.Peaceful Coexistence/Peace Education/Inclusive Education 3.Self, People, and Places 4.Patriotism/National Pride 5.Nature 6.Gender Equality 7.Festivals and Cultural Events 8.Role Models Male/Female (Past /Present) 9.Environmental Education 10.Population Education 11.Travel and Transport 12.Technology 13.Education and Employment (Careers/ Occupations) 14.Dignity of Labor 15.Media 16.Crisis Awareness and Management 17.Participatory Citizenship 18.Health, Safety, Drug Education 19.Life Skills Education 20.Avoiding Social

Evils 21.Sports 22.Adventure 23.Basic Education on cleanliness and wastage of Energy 24.Biography

اس تقابلی مطالعے سے واضح ہے کہ نئے مجوزہ نصاب میں مندرجہ ذیل موضوعات وتصورات شامل نہیں کیے گئے۔

1.Ethics and values (Moral character in accordance with rules of right and wrong) 2.Patriotism/ National Pride 3.Festivals and Cultural Events 4.Role Models Male/Female (Past/Present) 5.Dignity of Labor 6.Crisis Awareness and Management 7.Participatory Citizenship

اس کا مطلب واضح ہے کہ نئے نصاب میں سے اخلاق، اقدار، مشاہیر (سیرۃ النبی، سوانح، ہیروز وغیرہ) حب وطن، مقامی، ثقافتی مظاہر، محنت کی عظمت اور شہری حقوق وفرائض کو نکال دیا گیا ہے اوران کی جگہ مغربی مشاہیر، اقدار اور ثقافت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

اردو اور انگریزی کے نصاب کا یہ ایک ابتدائی جائزہ ہے ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلے کو مزید آگے بڑھا سکیں۔

بقیہ: افغانستانی معیشت مستحکم ہورہی ہے

اگر یہ مطالبہ بین الاقوامی سامراجی ادارے قبول نہ کریں تو انہیں فی الفور ملک بدر کر دیا جائے۔ الحمدللہ امارت اسلامیہ اس پوزیشن میں ایک خودکفیل معاشی حکمت عملی تشکیل دے رہی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسے سامراجی بھیک کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسلامی جمہوری ایران کی طرح اسلامی امارت افغانستان بھی ایک غیر معمولی اسلامی ریاست ہے۔ ایک ایسی اسلامی ریاست جو عالمی دارالحرب میں گھری ہوئی ہے اور جس کا وجود سرمایہ دارانہ عالمی نظاماتی شکست وریخت کی ایک علامت ہے۔ جیسے جیسے عالمی سرمایہ دارانہ بحران گھمبیر ہوتا جائے گا ویسے ویسے یہ غیر معمولی اسلامی ریاستیں قائم ہوتی جائیں گی اور یہ سب خودکفیل، خودانحصاری، غیر سرمایہ دارانہ ریاستیں ہوں گی۔ اسلامی انقلابیوں کا فرض ہے کہ وہ ان غیر معمولی اسلامی ریاستوں کی جدوجہد میں شریک ہوں اور اپنے ملک کی تمام اسلامی جماعتوں اور گروہوں سے مطالبہ کریں کہ وہ ان غیر معمولی اسلامی ریاستوں کی پشتیبان بن جائیں۔

تفہیم مغرب

سید خالد جامعی

میڈیکل سائنس یا کھیل تماشہ

نیو یارک ٹائمز میں شراب سے متعلق ایک اہم سائنسی رپورٹ شائع ہوئی ہے کہ شراب کیسے پئیں، کب پئیں، کون سی پئیں، کتنی مقدار میں اور کن اوقات میں پئیں۔ یہ سب کام سائنس دان ہی بتا رہے ہیں۔ رپورٹ کا عنوان ہے:

A Tougher look at Drinking [New york Times17-7-20]

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شراب کے بارے میں سائنس دانوں کی تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ہر پانچ سال کے بعد سائنس نئی تحقیق پیش کرتی ہے اور نئے حقائق سامنے لائے جاتے ہیں لہٰذا امریکہ اور یورپ کی حکومتیں سائنس دانوں کی بدلتی ہوئی تحقیقات کی روشنی میں مسلسل عوام کے لیے رہنما خطوط (Guidelines) تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

۱۔ ۱۹ ویں صدی میں سائنس دانوں نے کہا کہ شراب نقصان دہ ہے۔ امریکہ میں ریاست نے کروڑوں صفحات پر مشتمل لٹریچر شائع کیا۔ لہٰذا شراب پر پابندی لگائی گئی مگر ہنگاموں، احتجاج اور توڑ پھوڑ کے بعد یہ پابندی اٹھالی گئی اور شراب کے فوائد سائنس دان بیان کرنے لگے۔

۲۔ کئی عشروں تک سائنس دانوں نے بتایا کہ دن میں ایک دو دفعہ شراب پی لینا صحت کے لیے مفید ہے۔

۳۔ پھر نئی تحقیق آ گئی کہ اعتدال میں رہ کر شراب نوشی صحت سے متعلق خدشات کو کم کرتی ہے۔

۴۔ ۲۰۱۵ء تک سائنس دان یہ بتاتے رہے کہ روزانہ ۱۲ اونس Beer، پانچ اونس Wine اور ڈیڑھ اونس Distilled Spirits صحت کے لیے خطرہ نہیں ہوتی۔

۵۔ ۲۰۲۰ء میں یہ تحقیق سامنے آئی کہ جو لوگ روزانہ ایک گلاس وائن، بیئر پیتے ہیں وہ بھی غلط کرتے ہیں کیونکہ سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ ''یہ سمجھنا غلط ہے کہ شراب نوشی سے صحت بہتر ہوتی ہے لہٰذا اس کا کم سے کم استعمال ہی صحت کے لیے موزوں ہے۔''

سائنس کی بدلتی ہوئی تحقیقات کے تماشے دیکھتے جایئے:

۶۔ حال ہی میں نیشنل کینسر انسٹیٹیوٹ امریکہ کی یہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ اگر ایک دن میں آپ شراب کا ایک گلاس بھی پئیں تو اس سے کئی قسم کے کینسر ہونے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ بعض علماء کرام اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے اسی سائنس کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ کیا ان علماء کو تفسیر جواہر القرآن کا انجام معلوم نہیں؟

رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آسٹریلیا، برطانیہ، فرانس اور دوسرے مغربی ممالک نے بھی روزانہ اور ہفتہ وار شراب پینے کے رہ نما خطوط (Guidelines) تبدیل کر دیے ہیں۔ ان ملکوں کی وزاتِ صحت اور سائنس دانوں کی تحقیق یہ ہے کہ کم سے کم شراب استعمال کی جائے۔ اس کا روزانہ اور زیادہ استعمال صحت کے لیے خطرناک ہے کیونکہ اس سے کینسر ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

ہمیں حیرت ہے کہ عالم اسلام کے متجددین اور اب بعض راسخ العقیدہ علماء بھی جدید سائنس سے بے حد متاثر ہیں۔ جدید سائنس کی یہ تحقیقات علماء کی خدمت میں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ سائنس کے عشق اور عقیدت سے آزاد ہو کر سائنس کی حقیقت و حقانیت پہ غور کریں۔ سائنس کا نتیجہ روزانہ بدلتا ہے۔ آپ ایسی بدلتی ہوئی سائنس کو علم کیسے تسلیم کر سکتے ہیں؟

مضمون کے آخر میں ایک بڑے سائنس دان نے کم شراب پینے والوں کو بھی شراب پینے کے طریقے بتائے ہیں ورنہ یہ کم شراب بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ طریقے آپ بھی پڑھیے اور ہنستے رہیے۔ سائنس کا ارتقائی سفر اسی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔

''کھانے کے ساتھ تھوڑی سی شراب لیجیے، آہستہ آہستہ پیجیے، اتنی نہ پیجیے کہ خمار چڑھ جائے، روزانہ ورزش کریں، سگرٹ نوشی نہ کریں، غذائیت سے بھرپور غذا کھائیں اور اپنا وزن نارمل رکھنے کی کوشش کریں۔''

دوسرے لفظوں میں سائنس دان یہ کہہ رہا ہے کہ شراب پینا چھوڑ دو کیونکہ ان ہدایات اور اصولوں پر کوئی عمل نہیں کر سکتا۔ واضح رہے کہ BMJ نے ۲۰۱۴ء میں ایک تحقیقی مقالہ شائع کیا تھا اور یہ لکھا تھا کہ روزانہ دو گلاس شراب پینا فائدہ مند ہے۔ جدید سائنس اسی طرح بدلتی رہتی ہے۔

افغانستان ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

افغانستانی معیشت مستحکم ہو رہی ہے

امریکی جاسوس اور تخریب کار ادارے ورلڈ بینک نے ایک ہمہ پہلو افغان معاشی نظام کی جانچ پڑتال کا منصوبہ وضع کیا ہے جس کا نام "افغانستان کا مستقبل" ہے۔ اس جاسوسی کا مقصد افغان عوام تک سامراج کی براہ راست پہنچ کو وسعت دینا ہے تا کہ وہ اسلامی حکومت کے بتدریج باغی ہو جائیں۔

اس پروگرام کے تحت ایک ششماہی رپورٹ Afghanistan's Development Update بھی شائع کی جائے گی۔ ماہانہ اعلامیے بھی جاری کیے جائیں گے اور نجی شعبہ، گھرانوں اور خواتین کے رجحانات پر مستقل سروے بھی کیے جائیں گے۔ یہ تخریب کاری کی ایک منظم پیش رفت ہے جس کے موثر مقابلہ کے لیے افغان حکومت کو دیر پا منصوبہ بندی کے ذریعے ورلڈ بینک کی افغان عوام تک براہ راست رسائی ناممکن بنانی چاہیے۔

پہلی جاسوسی رپورٹ Afghanistan's Monetary Report فروری 2023ء میں شائع کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں پیش کردہ اعداد و شمار ورلڈ بینک کی تخریب کار ایجنسی Third Party Monitoring Agency سے حاصل کیے گئے جو سٹیلائٹ ٹیکنالوجی کے ذریعہ افغانستان میں تخریب کاری کی ذمہ دار ہے۔

لیکن اس رپورٹ میں جو اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں وہ سامراج کے توقعات کے بالکل برعکس ہیں۔ پچھلے دو سالوں سے سامراج یہ جھوٹ بول رہا ہے کہ طالبان حکومت کے تحت افغان معیشت زبوں حالی کا شکار ہے، وہاں قیمتیں ہوش ربا ہیں اور لوگ بھوکوں مر رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین کو تنخواہیں ادا نہیں کی جا رہیں۔ بے روزگاری اور انفلیشن (inflation) ہوش ربا سطحوں تک پہنچ گئی ہے۔

ورلڈ بینک کی جاسوسی رپورٹ ان جھوٹوں کی مکمل تردید کرتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق:

1۔ انفلیشن کی شرح نمو (CPI growth rate) میں 2022ء اور 2023ء میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ حکومتی مالیاتی پالیسی کے نتیجہ میں شرح انفلیشن جنوری 2023ء میں 50

فیصد گھٹی اور افغانی کی شرح تبدل مستحکم رہی۔

2۔ جنوری 2023ء میں عام گھریلو استعمال کی اشیا کی قیمتیں جنوری 2022ء کے مقابلہ میں 5 فیصد کم تھیں اور پورے ملک میں اشیائے خورد ونوش اور گھریلو استعمال کی اشیا کی دستیابی 48 فیصد رہی۔

3۔ شرح تبادلہ (Rate of Exchange) کے استحکام کی وجہ رسد زر (money supply) کا معمول کا اجراء رہا جس پر مرکزی بینک موثر انداز میں کنٹرول کرنے میں کامیاب رہا۔ پاکستانی روپیہ کے مقابلہ میں افغانی کا شرح تبدل 2022ء میں 4.7 اور ایرانی تومان کے مقابلہ میں 1.9 فیصد بڑھا۔ ڈالر کے مقابلہ میں افغانی کی شرح تبادلہ بالکل مستحکم رہی۔ حکومت کا زرمبادلہ کی سرکولیشن پر مستحکم کنٹرول رہا۔

4۔ بینک ڈپازٹس کے انخلا (withdrawal) پر سے تمام پابندیاں اٹھالی گئی ہیں اور تمام بینک صارفین کے تمام مطالبات وقت پر پورا کرتے ہیں۔

5۔ اٹھانوے فیصد سرکاری ملازمین کی تنخواہیں وقت پر ادا کی جا رہی ہیں۔ سردیوں (بالخصوص شدید برف باری کے باوجود) نہ اجرتوں میں کمی واقع ہوئی نہ مجموعی اجرتی ملازمتوں میں۔

6۔ مارچ 2022ء سے جنوری 2023ء تک حکومتی محصولات کا مجموعی حجم تقریباً 150 ملین اضافی رہا۔ توقع ہے کہ مارچ 2023ء تک یہ بڑھ کر تقریباً 196 ملین افغانی ہو جائے گا۔ درآمدی محصولات پر نافذ محصولات اور محصولاتی آمدنی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

7۔ سال 2022ء میں افغان درآمدات کا حجم 9.1 ملین ہو گیا جو 2021ء کے مقابلہ میں 223 فیصد زیادہ ہے۔ میوہ جات، پھلوں، معدنیات کی برآمدات بہت تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ 63 فیصد برآمدات پاکستان کو کی گئی ہیں جن میں پھلوں، میووں اور کوئلے کی برآمدات سب سے زیادہ ہیں۔

8۔ درآمدات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ درآمدات کا بڑا حصہ صنعتی شعبہ کا ہے اور کیمیائی اشیا، مشینری اور مواصلاتی اشیا کی درآمدات تیزی سے بڑھی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغانی صنعت کی پیداواری سکت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور دولت افزائی اور صنعت

کاری کا عمل تیزی سے جاری ہے۔

ورلڈ بینک اقرار کرتا ہے کہ معاشی استحکام کی وجہ یہ ہے کہ طالبان حکومت معاشی بدعنوانی اور کرپشن پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی ہے جو غدار حکومتوں کے دوران (2002 تا 2021ء) اپنے عروج پر تھیں۔ یہ طالبان کے مثالی عدالتی نظام کی کارفرمائی کا ایک ثمر ہے۔ عسکری جدوجہد کے دوران طالبان نے جو پورے ملک میں عسکری صف بندی کی تھی وہ پوری طرح فعال ہے اور معاشی پالیسی کی ترتیب اور تنفیذ میں ایک اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

ورلڈ بینک کی اس رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ افغانستان میں نہ فاقہ کشی ہے، نہ بے روزگاری عام ہے۔ نہ افلاس کا سیلاب آیا ہوا ہے اور نہ قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ طالبان ایک غیر سرمایہ دارانہ اسلامی معیشت قائم کر رہے ہیں اور اس جدوجہد کی ابتدا میں معاشی استحکام قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور توقع ہے کہ سال رواں (2023ء) میں قومی پیداوار (جی ڈی پی) کی شرح نمو 5 فیصد سے تجاوز کر جائے گی۔ ایران کی طرح افغانستان میں بھی امریکی ناکہ بندی کی پالیسی بری طرح ناکام ہو رہی ہے۔

تاہم یہ امر خطرناک ہے کہ ورلڈ بینک (جو ایک امریکی جاسوسی ادارہ ہے اور جس کی جاسوسی کارروائیوں کے بین ثبوت بولیویا، ایکواڈور اور دیگر لاطینی امریکی ممالک میں طشت از بام کیے جاتے رہتے ہیں) آج افغانستان میں براہ راست اطلاعات جمع کر رہا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک ادارہ Third Party Monitoring Agency قائم کر دیا ہے جو عوام سے انٹرویوز لے رہا ہے اور سٹیلائٹ ٹیکنولوجی کے ذریعہ بھی دخل اندازی کر رہا ہے۔ ورلڈ بینک کی تحقیق کا اصل مقصد افغان عوام کو اسلامی حکومت سے بدظن کرنا اور سرمایہ دارانہ عالمی شکنجہ میں کسنا ہے۔ اسلامی حکومت کو فی الفور ورلڈ بینک کی Third Party Monitoring Agency کی تخریبی کارروائیوں اور اس کی عوامی رابطہ کی جاری مہم کو معطل کرنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

افغان ریاستی آمدنی میں تیز رفتار ترقی

اسلامی انقلابیوں کو مبارک ہو۔ افغانستان میں معاشی استحکام ہنوز ترقی پذیر ہے۔

سامراجی اداروں بالخصوص اقوام متحدہ کے تخریب کار اداروں کے پروپیگنڈا کی نفی دوسرے سامراجی ادارے کرنے پر مجبور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں نہ افراط زر (inflation) ہے نہ بے روزگاری ہے نہ لوگ فاقہ کشی کا شکار ہیں۔

حکومتی وسائل میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ طالبان انتظامیہ محصولات (tax and non-tax) کی وصول یابی میں کامیاب ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت نے محصولاتی نظام میں کرپشن کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ غدار حکومتوں کے دور (2002 تا 2021ء) میں محصولاتی کرپشن ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیکس دہندگان انتظامیہ سے بدظن تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان سے لیا گیا ٹیکس حکومتی بدعنوانیوں میں ضائع ہو جائے گا۔ آج عوام طالبان پر بھرپور اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں اور بخوشی اور رضا کارانہ طور پر ٹیکس واجبات ادا کر رہے ہیں۔

اپنی فروری 2023ء کی رپورٹ میں ورلڈ بینک نے اقرار کیا ہے کہ جنوری تا ستمبر 2023ء تک طالبان حکومت کی ٹیکس وصولیاں 136 بلین افغانی سے تجاوز کر گئی ہیں اور ورلڈ بینک پیش گوئی کرتا ہے کہ سال 2022ء اپریل سے سال 2023ء مارچ تک کا ٹیکس وصول یابی کا حکومتی ہدف بآسانی حاصل ہو جائے گا۔ WGAE توقع رکھتا ہے کہ محصولیاتی وصولیاں حکومتی ہدف سے تجاوز کر جائیں گی۔

افغانستان میں مقیم غیر ملکی اہل کار نے اے ایف پی نیوز ایجنسی کو بتایا کہ وہ بھی طالبان حکومت کی محصولیاتی کارفرمائی کے شاہد ہیں۔ اس نمائندے نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ افغان معیشت کا انحصار اقوام متحدہ کی دی گئی بھیک پر روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

طالبان کے قائم کردہ نظام عدل اور راست روی کا اقرار وہ پاکستانی تاجر بھی کرتے ہیں جو پاکستانی برآمدات وہاں پہنچاتے رہتے ہیں۔ ایک تاجر نے اے ایف پی کو بتایا کہ غدار حکومت کے دوران اس کو پاکستانی سرحد سے مزار شریف تک جانے کے لیے حکومتی اہل کاروں کو پچیس ہزار افغانی رشوت دینا پڑتی تھی۔ اب اس سفر کے دوران ایک پیسہ کی رشوت بھی طلب نہیں کی جاتی۔ پورا راستہ محفوظ اور پرامن ہے۔

افغانی برآمدت بالخصوص کوئلے اور کرومائٹ میں بھی تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور

پاکستان ان افغان برآمدات کی ادائیگیاں روپے میں کرتا ہے ڈالر میں نہیں۔ ایک امریکی تخریب کار ادارہ XCEDT کے مطابق افغان کوئلے کی برآمدات پاکستان کو 2022ء میں دوگنی ہوگئی ہیں۔ اس برآمد سے افغان حکومت کی ٹیکس وصولیوں میں 160 ملین ڈالر کا 2022ء میں اضافہ ہوا جو غدار حکومت کی اس نوعیت کی ٹیکس وصولیوں سے دوگنا سے بھی زیادہ ہیں۔ غدار سابق وزیر تجارت جو امریکا میں مقیم ہے اور جس کا نام سلمان بن شاہ ہے اس بات پر افسوس کا اظہار کر چکا ہے۔ سامراجی ادارے افغانستان میں انسداد کرپشن اور دہشت گردی کا اب اقرار کرنے لگے ہیں۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کے کرپشن انڈیکس 2022ء میں افغانستان کے رینک میں 24 درجوں کا اضافہ ہوا ہے۔

امارت اسلامیہ میں ایک جہادی معیشت قائم کی جارہی ہے۔ 2001 تا 2021ء کے دور میں مجاہدین کا افغانستان کے بڑے علاقے پر غلبہ رہا تھا۔ مجاہدین نے مقامی انتظامیہ، عدلیہ اور محصولیاتی نظام قائم کر دیا تھا جس کو عوام کی بھرپور حمایت اور تعاون حاصل رہا۔ آج مجاہدین کا قائم کردہ یہی نظام ملک بھر میں پوری طرح کارفرما ہے۔ اسی عوامی انتظامی ڈھانچہ کے پھیلاؤ کے ذریعے امارت اسلامیہ کی ہمہ گیر قومی معاشی منصوبہ بندی سامراج کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔ سامراج اور اس کے پالیسی سازوں کو امید تھی کہ معاشی مشکلات کے دباؤ کے نتیجہ میں افغان حکومت جیتی ہوئی جنگ اقتصادی میدان میں ہار جائے گی جیسا کہ ویت نام، کمبوڈیا، بولیویا اور چلی میں ہوا۔ اسی امید پر اقوام متحدہ نے ہیومینیٹیرین ایڈ جاری رکھی تا کہ افغانستان میں سامراجی تخریب کاری کو منظم کیا جاتا رہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ بھیک کہاں خرچ کی جارہی ہے اور حالیہ اطلاعات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ کرپشن کی نذر ہو رہا ہے۔ اسلامی حکومت کو اس بڑھتی ہوئی عالمی سامراجی کرپشن پر قابو پانے کے لیے اقوام متحدہ کے اداروں (ڈبلیو ایچ او، یونیسکو، آئی ایف اے وغیرہ) کی افغان عوام تک براہ راست رسائی کو فی الفور منقطع کرنا چاہیے اور اس بات کو بھی یقینی بنانا چاہیے کہ افغانی معاشی اطلاعات تک مغربی سامراجی اداروں (نہ صرف یو این کی ایجنسیوں بلکہ ورلڈ بینک، ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل وغیرہ) کی رسائی صرف حکومتی ذرائع تک محدود ہو جائے۔ عوام سے براہ راست رابطہ بالکل ناممکن بنا دیا جائے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۲۶)

تفہیم دین   ڈاکٹر محمد امین

فکر اسلامی۔ روایت، جدّت اور جدیدیت

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں عالمی کانفرنس سے مدیر البرہان کا خطاب

جدت قابل قبول ہے جبکہ جدیدیت قابل ردّ ہے

اس موضوع کو صحیح تناظر میں نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اس عنوان میں موجود الفاظ/ اصطلاحات کو نہ سمجھا جائے۔ ہمارے نزدیک ''روایت'' سے مراد ہے قرآن وسنت سے تمسک اور دین کی وہ تعبیر جو اسلاف اور جمہور علماء سے منسوب ہے اور جس میں منصوص امور اور محدثات میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اس کے دلائل وہی ہیں جو اجتہاد اور اجماع کی حجیت کے ہیں جیسے قرآن حکیم میں ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾[التوبہ۹: ۱۱۹]اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لاتجتمع امتی علی الضلالة"[۱] روایت کا مطلب نہ تو تقلید ہے اور نہ جمود کیونکہ اجتہاد صحیح جدت کی قبولیت کا مظہر ہے۔

''جدت'' سے مراد ہر نئی چیز اور نیا اضافہ ہے۔ اسلام میں ہر وہ جدت قابل قبول ہے جس کی اصل دین میں ہو یعنی وہ قرآن وسنت کے اصول واقدار اور مقاصد کے خلاف نہ ہو۔ اس کا ثبوت نبی کریم ﷺ کا وہ قول مبارک ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: "من احدث فی امرنا ھذا لیس منه فھو ردّ"[۲] اور اس سے آپ ﷺ کے اس قول مبارک کی وضاحت اور تحدید ہوجاتی ہے جس میں آپ نے فرمایا: "کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة وکلّ ضلالة فی النار"[۳] جیسے آج کل کے ہسپتال، تعلیمی ادارے، ٹریفک رولز، ہوائی جہاز، میزائل وغیرہ۔

---

[۱] سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۹۵۰

[۲] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۴۹۳

[۳] سنن النسائی، رقم الحدیث: ۱۵۷۸

جدت سے متعلق دو اصطلاحات اور ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان میں سے ایک ہے ''تجدید''۔ تجدید کا مطلب یہ ہے کہ اگر دین میں ایسی جدتوں/ جدید امور کا اضافہ کرلیا جائے جن کی اصل دین میں نہ ہو (یعنی وہ نا قابلِ قبول بدعت ہوں) تو ان کی نفی اور تردید کرنا، انہیں مٹانا اور معاملے کو اصل کی طرف لوٹانا تجدید کہلائے گا۔ اسی طرح کی ایک اصطلاح ''تجدد'' ہے۔ تَجَدُّدْ بروزن تَفَعُّلْ ہے جس میں تکلف پایا جاتا ہے۔ اس سے مراد ہے ہر وہ جدت اور جدید امر جو اصلاً دین میں نہ ہو لیکن اسے بتکلف (تجدید اور تجدد کے نام پر) دین کا حصہ بنا دیا جائے جیسے مغرب کی الحادی تہذیب یا ہندو تہذیب کی اقدار و مظاہر کو مطابق اسلام قرار دینا۔ ظاہر ہے تجدد غیر اسلامی ہے اور نا قابلِ قبول ہے۔

''جدیدیت'' ایک اصطلاح ہے جو انگریزی اصطلاح Modernity یا Moderninsm کا ترجمہ ہے۔ جدیدیت کے لغوی معنی لے کر اسے جدت یا جدید سے متعلق قرار دینا غلط ہے۔ ماڈرنٹی کا عمومی مفہوم مغربی فکر و تہذیب کا ہے۔ یعنی وہ جدید افکار اور جدید تہذیب جو مغرب میں نشأۃ ثانیہ (Renaissance) اور تحریک اصلاح (Reformation) کے بعد تحریک تنویر (Enlightenment) کے نتیجے میں منصۂ شہود پر آئی۔ ہمیں یہاں جدیدیت اور پس جدیدیت (Modernity and Post-modernity) میں فرق کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے پوسٹ ماڈرنٹی بھی اتنی ہی غیر اسلامی ہے جتنی ماڈرنٹی اور ان دونوں کی اصل حیثیت ہمارے لیے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کی ہے۔

جدیدیت اور مسلم ردِّ عمل

اسلام اور جدیدیت میں تعامل کے حوالے سے چار طرح کا مسلم ردِّ عمل سامنے آتا ہے:

۱۔ جدیدیت کو ردّ کر دیا جائے ۲۔ اسے قبول کرلیا جائے

۳۔ اس سے مفاہمت کر لی جائے ۴۔ اسے اگنور کر دیا جائے

اب ہم ان چاروں نکات کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

پہلا ردّعمل: جدیدیت کو ردّ کر دیا جائے

ہماری رائے میں مسلمانوں کو جدیدیت یعنی مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کر دینا چاہیے۔ اس کے قابل ردّ ہونے کے ہمارے پاس تین محکم نقلی اور عقلی دلائل ہیں:

۱۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ جدیدیت ہے کیا؟ جدیدیت کی آئیڈیالوجی یا اس کے بنیادی نظریات (جس طرح مسلمانوں کے عقائد ہوتے ہیں) یہ ہیں: ہیومنزم (Humanism)، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپریسزم (Empiricism)۔ ہم یہاں تفصیل میں نہیں جا سکتے لہٰذا تلخیصاً عرض کرتے ہیں کہ ہیومنزم کا مطلب ہے انسان کی خود مختاری، اللہ کے مقابلے میں۔ سیکولرزم کا مطلب ہے کہ انسان اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست کے معاملات میں اللہ اور دین/ مذہب کا پابند نہیں ہے مطلب یہ کہ انسان چونکہ خود مختار ہے لہٰذا جہاں چاہے اللہ اور دین/ مذہب کی مانے اور جہاں چاہے نہ مانے۔ لبرل ازم کا مطلب یہ ہے کہ انسان چونکہ اپنی مرضی کا آپ مالک ہے لہٰذا وہ آزاد ہے کہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ کیپٹل ازم کا مفہوم ہے دنیا اور مال کی محبت یعنی صرف دنیا کی آسائشیں اور راحتیں ہی مطلوب ہیں آخرت کس نے دیکھی ہے؟ ایمپریسزم سے مراد ہے کہ حتمی علم صرف وہ ہے جو عقل اور انسانی تجربے و مشاہدے اور حسی معلومات پر مبنی ہو اور یہ کہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے ملنے والی ہدایت قابل اعتماد علم نہیں ہے۔

اس آئیڈیالوجی اور ان نظریات سے جو ورلڈ ویو سامنے آتا ہے اس کی رو سے مغرب کا تصور انسان یہ ہے کہ انسان مختار مطلق ہے، وہ کسی الٰہ کا عبد نہیں ہے جس کی عبادت و اطاعت اس کے لیے ضروری ہو۔ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے، آخرت کی حقیقت کا ہمیں پتا نہیں۔ وحی کوئی چیز نہیں اور نہ اللہ کی ہدایت کی کوئی حیثیت ہے۔

ظاہر ہے مذکورہ بالا نظریات اور ان پر مبنی ورلڈ ویو خالصتاً غیر اسلامی ہے اور توحید، رسالت اور آخرت کے بالکل الٹ ہے جس میں انسان اللہ کا عبد ہے، اللہ کی ذات ہی انسان کی خالق، مالک، معبود، رازق اور سب کچھ ہے اور آخرت کو دنیا کی زندگی پر ترجیح حاصل ہے۔ گویا جدیدیت اور مغربی فکر و تہذیب مبنی بر کفر و جہالت ہے۔ یہ محض تہذیب نہیں بلکہ اسلام

کے برعکس اوراس سے متضاد مکمل نظام حیات اور وضعی دین ہے لہٰذا یہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

۲۔ مغربی فکر وتہذیب کے علمبردار اکثر لوگ عیسائی و یہودی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں واضح الفاظ میں فرمایا ہے کہ وہ کافر ہیں اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اس بارے میں بہت سی آیات اور احادیث موجود ہیں، ہم اختصار کی خاطر صرف دو آیات کا ذکر کریں گے:

اہل کتاب کافر ہیں

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ اُولٰٓىٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ﴾ [البینہ ۶:۹۸]

''جو لوگ کافر ہیں (یعنی) اہل کتاب اور مشرک وہ دوزخ کی آگ میں پڑیں گے (اور) ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔''

اہل کتاب مسلمانوں کے دشمن ہیں

﴿هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [آل عمران ۳:۱۱۹]

''دیکھو تم ایسے (صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (اور وہ تمہاری کتاب کو نہیں مانتے) اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں (ان سے) کہہ دو کہ (بدبختو) غصے میں مر جاؤ، خدا تمہارے دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے۔''

۳۔ نہ صرف مغربی فکر وتہذیب اسلام سے مختلف ہے اور اس سے متضاد اور اس کے مقابلے میں دین کفر اور الحادی نظام حیات ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ہمیں یہود ونصاریٰ کے بارے میں بتادیا ہے کہ وہ کافر ہیں اور مسلمانوں کے بدخواہ اور دشمن ہیں بلکہ اس تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک کی اسلام اور مسلم دشمنی اظہر من الشمس ہے۔ ماضی میں

انہوں نے مسلمانوں کو مٹانے کے لیے صدیوں تک صلیبی جنگیں جاری رکھیں۔ پھر جب انہوں نے مسلمانوں کو روبہ زوال دیکھا تو سازشیں کر کے اور دھکا دے کر ان کی ہلتی دیوار کو گرا دیا اور گھر پر قابض ہو گئے۔ انہوں نے مسلمان ملکوں کو لوٹا، کھسوٹا، کچلا اور تباہ کیا۔ ان کا نظام خلافت ختم کیا اور مسلمان ممالک کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کے اجتماعی اداروں اور نظاموں (سیاسی نظام، تعلیمی نظام، معاشی نظام، عدالتی نظام وغیرہ) کو ختم کر کے اپنی تہذیب اور اپنے نظریات کے مطابق ان کی تشکیل نو کی تا کہ وہ ہمیشہ ان کے غلام رہیں۔

پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ مسلمان ممالک کو آزادی دینے پر مجبور ہوا تو اس نے کارِ استعماریت امن کا چولا پہن کر جاری رکھا اور مسلم حکمرانوں، دانشوروں، صحافیوں، ادیبوں کو دامِ تزویر میں لا کر فکری اور عملی غلامی جاری رکھنے کی بھرپور کوششیں کیں تا کہ مسلمان غلامی کی دلدل سے نہ نکل سکیں۔ ان کی یہ کوششیں اکثر وبیشتر کامیاب ہوئیں لیکن کہیں کہیں مسلمان ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ پاکستان نے ایٹمی اسلحہ بنالیا، صدام نے طاقتور فوج تیار کر لی، افغانستان نے شریعت نافذ کرنا شروع کر دی، ملائشیا اور ترکی مالی لحاظ سے بہتر ہو گئے تو اسلام اور مسلم دشمن مغرب اسے برداشت نہ کر سکا اور امریکہ نے یورپ اور دوسرے حلیفوں کو ساتھ ملا کر عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کر دیا۔ شام اور یمن تباہی کے کنارے پر ہیں اور پاکستان، ترکی، ایران وغیرہ پر شدید دباؤ ہے۔

ان تین دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب کی فکر وتہذیب الحادی ہے، یہ اسلام سے متضاد ہے اور توحید، رسالت وآخرت کی منکر ہے، دین ومذہب دشمن ہے۔ مبنی بر کفر وضعی دین اور نظام حیات ہے جو اسلام کے مقابلے میں اپنا غلبہ چاہتی ہے۔ قرآن وسنت ان لوگوں کے کفر اور ان کی اسلام ومسلم دشمنی کے گواہ ہیں اور ہم نے دیکھتی آنکھوں انہیں اسلام اور مسلم دشمن پایا ہے لہٰذا مسلمان جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب کو قبول نہیں کر سکتے۔ اسے ردّ کرنا ان کی فکری، عملی اور شرعی ضرورت اور تقاضائے ایمان وحمیت ہے۔

۲۔ دوسرا ردّعمل: مغربی تہذیب کو قبول کر لیا جائے

جدیدیت اور مغربی فکر وتہذیب کی جو حقیقت ہم نے سطور بالا میں واضح کی ہے اس کے

بعد کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ وہ مغرب کی الحادی اور لادین فکر و تہذیب کو قبول کرنے کا سوچے لیکن دو ڈھائی صدیوں کی فکری و عملی غلامی کے اثرات بہت گہرے ہیں اور مسلمان حکمرانوں، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کی آنکھیں مغرب کی ظاہری ترقی اور غلبے کی چکا چوند سے خیرہ ہو چکی ہیں۔ وہ مغرب سے مرعوب ہیں، اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں اور اس کی اقدار کو اپنانا چاہتے ہیں۔ اکثر مسلم حکومتیں چونکہ مغرب نواز ہیں اس لیے مسلمان ممالک کے حکمرانوں کی ساری قوت دین کے علمبرداروں کے خلاف استعمال ہو رہی ہے اور اس میں انہیں مغرب کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔ بلکہ مغرب ہی کے دباؤ پر مسلمان حکمران گماشتہ کا کردار ادا کرتے ہیں اور یہی حال ان اہل دانش کا ہے جو فکری افلاس اور فکری غلامی کی وجہ سے مغربی تہذیب کے گن گاتے ہیں، اس کے لیے دلائل تراشتے ہیں بلکہ متجددین کا ایک پورا گروہ وجود میں آ چکا ہے جو مغربی اصول و اقدار کو مطابق اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مغربی تہذیب کو مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنا کر پیش کرتا ہے۔ سرسید سے لے کر غلام احمد پرویز، مولانا وحید الدین خاں اور جاوید احمد غامدی اس کی مثال ہیں۔

ظاہر ہے متجددین کی یہ روش ناقابل قبول ہے، غلط ہے، اسلام اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے اور قابل اصلاح ہے۔ اس کی بنیادی وجہ مغرب کی فکری غلامی ہے اور اس کا تدارک ضروری ہے۔ بقول اقبال ؎

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

تیسرا ردِّ عمل: مفاہمت کا رویہ

بعض اہل علم نے سمجھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مغرب سے استفادہ میں کوئی ہرج نہیں۔ ان کی اچھی چیزیں لے لی جائیں اور بری چیزیں چھوڑ دی جائیں جسے عربی میں "خذ ما صَفا ودَع ما کدر" کہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مغرب کی کوئی چیز غیر اقداری (Value Neutral) ہے بھی؟ کیونکہ خود مغربی فلاسفر (مثلاً کارل پوپر اور کوہن وغیرہ) یہ تسلیم کرتے ہیں کہ علم کبھی غیر اقداری نہیں ہوتا بلکہ سوچنے اور لکھنے والے کی ذہنیت اور فکر کی عکاسی کرتا

ہے۔علم کی دنیا میں دیکھیے تو مغرب کے سماجی علوم (Social Sciences) مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے بھرے پڑے ہیں۔سائنس وٹیکنالوجی کو لوگ غیر اقداری سمجھتے ہیں حالانکہ وہ ہرگز غیر اقداری نہیں۔ٹی وی، موبائل اور انٹرنیٹ نے مسلمانوں کے اخلاق وکردار خصوصاً نوجوان نسل اور مسلم خاندانی نظام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ آج ہر پاکستانی کر سکتا ہے۔اس کے علاوہ وہ یہ دیکھے کہ خود مغربی مفکر اور فلسفی (مثلاً ہائیڈیگر، ڈاکٹر سائمن رامو، ہزرل، ایرک فرام وغیرہ) تسلیم کرتے ہیں کہ ٹیکنالوجی مذہب واقدار کش ہے اور اپنی اقدار پیدا کرتی ہے۔علاوہ ازیں اسلام اور مغربی فکر وتہذیب دو متضاد پیراڈائمز ہیں جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلام اور مغربی فکر وتہذیب کو یکجا نہیں کیا جا سکتا اور ان میں تلفیق اور مفاہمت ممکن نہیں لہٰذا ان اہل علم کا رویہ غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ اگر مغرب کی لادین جمہوریت میں تھوڑا سا اسلام ڈال دیا جائے تو ''اسلامی جمہوریت'' یا ''روحانی جمہوریت'' وجود میں آجاتی ہے اور اگر مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام مثلاً بینکنگ میں تھوڑا سا اسلام ڈال دیا جائے تو 'اسلامی بینکنگ' وجود میں آجاتی ہے۔کیونکہ اسلام اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب میں تلفیق ومفاہمت ممکن ہی نہیں۔یہ نقل وعقل دونوں کی رو سے جائز نہیں۔ہمارا عملی تجربہ ومشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ 'اسلامی جمہوریت' سے پاکستان میں مغربی اقدار سیکولرزم ولبرل ازم وغیرہ غالب آگئی ہیں، اسلام غالب نہیں ہوا۔لہٰذا اسلام اور مغربی فکر وتہذیب میں تلفیق ومفاہمت کا علامہ اقبال، مولانا مودودی، مفتی تقی عثمانی اور دوسرے اہل علم کا رویہ صحیح نہیں ہے۔

چوتھا رویہ: عدم اعتناء

ایک رویہ بعض دینی علمی حلقوں میں (مثلاً دینی مدارس وتبلیغی جماعت) کا یہ ہے کہ مغربی تہذیب کو اگنور کیا جائے۔چنانچہ دینی مدارس میں مغربی تہذیب کا مطالعہ شجر ممنوعہ ہے بلکہ علماء کرام انگریزی پڑھانے کے بھی روادار نہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض متجددین (مثلاً عمار ناصر وغیرہ) نے مدرسہ ڈسکورس کے نام سے مدارس کے طلبہ میں مغربیت کے بیج بونا شروع کر دیے ہیں اور مغرب کے سیاسی ومعاشرتی دباؤ پر بعض دینی مدارس نے مغربی طرز کی عصری تعلیم

اپنے ہاں دینا شروع کردی ہے۔ ہمارے دینی مدارس اسلام کے اجتماعی اداروں کی تدریس (جیسے اسلام کا معاشی نظام، سیاسی نظام، تعلیمی نظام وغیرہ) کے بھی قائل نہیں۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ایسے افراد تیار ہی نہیں کررہے جو عصری تناظر میں عوام کی رہنمائی کرسکیں یا مغربی تہذیب کے پیدا کردہ مسائل کے بارے میں تحقیق کرسکیں۔ خلاصہ یہ کہ مغربی فکر وتہذیب سے عدم اعتناء کا رویہ بھی صحیح نہیں ہے اور یہ بالواسطہ طور پر مغربی تہذیب کے اصول واقدار کے فروغ کا سبب بن رہا ہے۔

خواتین وحضرات!

ہم نے آپ کے سامنے اسلام اور مغربی فکر وتہذیب میں تعامل کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرکے واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغرب کی الحادی فکر کو قبول کرنے، اس سے مفاہمت کرنے اور اس سے عدم اعتناء کے رویے صحیح نہیں ہیں بلکہ صحیح اسلامی رویہ یہ ہے کہ اسے ردّ کردیا جائے کیونکہ جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب خلافِ اسلام ہے، مسلمانوں کو اسلام سے دور کررہی ہے اور ان کے زوال سے نکلنے اور ان کی دینی ودنیاوی ترقی میں رکاوٹ ہے۔

ہم اس امر کا انکار نہیں کرتے کہ تہذیبیں بندخانوں (Air tight Compartments) میں پروان نہیں چڑھتیں۔ وہ دوسروں کو متاثر بھی کرتی ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوتی ہیں لیکن ایک زندہ اور غالب تہذیب اگر کسی دوسری تہذیب سے انسانی سطح پر کیے گئے تجربات کی روشنی میں استفادہ کرتی بھی ہے تو اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اور دوسروں سے لی جانے والی چیزوں کو اپنے رنگ میں رنگ کر، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے اہل فارس سے ''دیوان'' نامی ایڈمنسٹریٹو پیکیج سے استفادہ کیا لیکن اسے اپنے رنگ میں ڈھال کر۔ لیکن اس وقت مسلم امہ کی یہ حالت ہے کہ اس کے حکمرانوں اور دانشوروں کی اکثریت مغرب کی فکری اور عملی غلام ہے۔ لہٰذا اگر وہ مغرب سے تھوڑا سا وہ استفادہ کرنے کا بھی سوچیں جو مباح ہوسکتا ہے، تو فکری غلامی کی وجہ سے امکان غالب ہے کہ وہ اس کی اندھی پیروی کرنے لگیں گے۔ اس لیے ہم اصول فقہ کے معروف قاعدے سدّ الذریعہ کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس اباحت کے استعمال سے بھی گریز ہی کرنا چاہیے اور مغربی فکر وتہذیب کے اصولی ردّ پر قائم رہنا چاہیے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العٰلمین۔

تفہیم دین　　　حافظ محمد عمران طحاوی

فکر اسلامی پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی کانفرنس

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبۂ فکر اسلامی نے ایک بین الاقوامی کانفرنس ''فکری مسائل میں روایت اور جدت۔ تاریخی اور عصری تناظر'' کے موضوع پر ۱۳ اور ۱۴ مارچ ۲۰۲۳ء کو منعقد کی جس میں دونوں دن حاضری کا راقم کو بھی موقع ملا۔ علم وفکر کے احیاء کی یہ کوشش بلاشبہ قابل ستائش ہے۔

ہم نے نوٹ کیا کہ برطانیہ اور جرمنی سے جو پاکستانی پروفیسرز اور ایک عالم دین افتتاحی اور اختتامی اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے ان کا رویہ مغرب سے مرعوبیت کا تھا۔ اسی طرح مقامی اہل علم اور دانشوروں میں سے ڈاکٹر خالد مسعود کے علاوہ جو اپنی سیکولر اور لبرل اپروچ کی وجہ سے معروف ہیں، ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی، ڈاکٹر فیروز الدین شاہ کھگہ، ڈاکٹر محی الدین ہاشمی اور دیگر بعض مقالہ نگاروں نے جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب سے مرعوبیت کا تاثر دیا۔ جن اہل علم نے کھل کر مغرب کی الحادی جدیدیت کو رد کیا اور صحیح اسلامی نقطۂ نظر کا دفاع کیا ان میں پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد، پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، پروفیسر جواد حیدر، فہد اللہ مراد شامل تھے۔ ڈاکٹر عبد الوہاب سوری نے آن لائن گفتگو کی اور انہیں وقت بھی کم ملا۔ اگر وہ ذاتی طور پر موجود ہوتے تو شاید مؤثر گفتگو کر پاتے۔ ڈاکٹر رشید ارشد، ڈاکٹر مبشر حسین اور کئی دوسرے حضرات نے اسلامی اور مغربی نقطۂ نظر دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر زاہد صدیق مغل سے توقع تھی کہ وہ جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب کے خلاف بولیں گے لیکن ان کی گفتگو سے مایوسی ہوئی اور انہوں نے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ ہماری علم کلام کی کلاسیکل روایت میں عقلیت کے خلاف کافی مواد موجود ہے جسے ہمیں استعمال کرنا چاہیے۔

ہمارا مجموعی تاثر یہ ہے کہ اکثر مقالہ نگاروں کا ذہن اسلام اور جدیدیت/مغربی فکر وتہذیب کے حوالے سے واضح نہیں تھا۔ بہت سے لوگ جدت اور جدیدیت میں فرق نہ کر پائے اور جدیدیت کو بھی جدت قرار دے کر اس کی حمایت کرتے رہے۔ ان کی گفتگوؤں سے

یہ بھی واضح ہورہا تھا کہ انہوں نے مغربی فکر وتہذیب کا کوئی مطالعہ نہیں کیا اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں ان کی کوئی حتمی رائے نہیں ہے۔خلاصہ یہ کہ یونیورسٹیوں کے علوم اسلامیہ کے اساتذہ میں بھی جدیدیت اور مغربی فکر وتہذیب کی صحیح تفہیم کے حوالے سے ابھی بہت محنت کی ضرورت ہے تاکہ فکری انتشار سے بچا جاسکے۔

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رُسولِ ہاشمی

سید خالد جامعی

افغانستان میں سیکولر تعلیمی اداروں کی کتنی ضرورت ہے؟

اسکول، کالج اور یونیورسٹی صنعتی معاشرے کی ضرورت ہیں۔افغانستان روایتی معاشرہ ہے جس کی روایتی معیشت ہے۔ اسے صنعتی معاشرہ بنانے کے لیے کفار کے قرضوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سیکولر تعلیم صرف لڑکیوں کی ہی نہیں لڑکوں کا بھی حق نہیں اور سیکولر تعلیم صرف منتخب لڑکوں کو دی جانی چاہیے، ملک کے ہر طالب علم کو دینا لازمی نہیں۔لڑکیوں کو ہوم اکنامکس کی تعلیم دی جائے ورنہ ان کو بھی نوکریاں دینی ہوں گی۔

افغانستان جیسے روایتی علاقوں میں گھریلو صنعتیں، روایتی کاروبار اور روایتی پیشے ہوتے ہیں جس سے قبیلے کے لوگ منسلک ہوتے ہیں، ان کو روزگار کے لیے کابل آنے کی ضرورت نہیں، وہاں کی معیشت آزاد، خودمختار اور خود کفیل ہے۔ اگر تعلیم یافتہ لوگ زیادہ تعداد میں آئیں گے تو ریاست ان کو نوکری کہاں سے دے گی؟ اس اصول پر غور کرنا چاہیے!

تفہیم دین		مکرم محمود{۱}

اِمیج کلچر

اخفاء ہماری روایتی دینی اقدار میں ایک بنیادی قدر ہے جو حیا کے خلق کے ساتھ ایک فطری تعلق رکھتی ہے۔ صورت اور حقیقت کی ایک فطری اور خلقی تفریق جو عالم ہست و بود میں پائی جاتی ہے اور جو شعور اپنے ہر عمل ادراک میں ایک بنیادی تناظر کے طور پر مستحضر رکھتا ہے اس قدر کو ایک مضبوط اساس فراہم کرتی ہے۔ حقیقت کی ساخت اور قوام اخفائی ہے اور صورت کا اظہاری۔ صورت اور ظہاری کی لازمی شرط محدودیت ہے جبکہ اخفائی حقیقت کی حدود کے تعین کا تصور اپنے اندر ایک منطقی تضاد رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی الحق اور حقیقت الحقائق ہے۔ وہ اپنے وجود، کنہ اور ذات کے حوالے سے اخفاء کی چادر لپیٹے ہوئے ہے اور اپنی نشانیوں کے اعتبار سے موجودات میں ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری نسبت سے غیب میں مگر اپنی شان کے مطابق نفس الامر میں موجود ہے۔ حق کا ظہور ہماری نسبت سے شہود ہے اور حق کا اخفاء ہماری نسبت سے غیاب ہے۔ غیب و شہود میں باہمی متناہیت اور لامتناہیت کی نسبت ہے۔

ہماری دینی روایت میں انسانی اخلاق و ملکات، اقدار اور اشیاء کے درجہ و مرتبہ کا تعین ان کی الحق اور حقیقت الحقائق سے نسبتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ کو اسی ضمن میں سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کی حقیقی ترقی دائرہ امکان میں الحق کے اخلاق کے تخلق ہی میں پنہاں ہے۔ الحق تغیر و تاثر سے ماوراء ہے۔ ظہور و شہود میں تغیر و تاثر و انفعال کارفرما ہے اور غیب و خفاء میں ثبات و فعالیت اور تاثر و تغیر سے ماورائیت کی کارفرمائی ہے۔ گویا ظہور تلوین (ہردم تغیر اور رنگا رنگی) ہے اور خفاء تمکین (حالت سکون، ثبات اور ٹھہراؤ)۔ تلوین سے تمکین کی طرف سفر انسان کا فطری اقتضاء اور اس کی آدرشی حرکت ہے۔ موجودہ عہد میں صورتوں کی یلغار نے انسان کے لیے اس فطری اقتضائی حرکت کو قریب قریب ناممکن بنا کر رکھ دیا ہے۔ صدیوں

{۱} معلم، دانشور (ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے نواسے)

سے جاری بت پرستی بھی صورت پرستی ہی کا اظہار ہے مگر پہلے بت ساکن ہوا کرتے تھے اب وہ بھی حرکت کرنے لگی ہیں۔ ویسے تو صورت پیکرِ محسوس ہونے کی بنا پر اپنی ذات ہی میں حقیقتاً متغیر ہوتی ہے چاہے یہ تغیر مشاہدنہ ہو مگر اب صورتیں صورتاً بھی متغیر ہونے لگی ہیں جو ہمارے مشاہدہ میں ہے۔ اس جال میں ہم گویا پھنسے پڑے ہیں حرکت کی گنجائش ہی نہیں پاتے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ارادہ موجود و متحرک تھا اور حرکت و آزادی کی کوشش جاری تھی مگر اب ارادہ مدہم پڑ گیا مایوسی کی وجہ سے نہیں بلکہ جال کی منطقی اور طبعی کشش اور لذت بخشی کی بنا پر۔ اس جال کے شکار، اس پر راضی اور اس سے لذت کشید کرنے والے اخفاء کی قدر کیا پہچانیں گے؟ جدیدیت نے جس صورت پرست انسان کو جنم دیا ہے وہ اخفاء کی حقیقت و اہمیت بھلا کیسے سمجھے گا؟

ہماری روایت جسے صورت سے حقیقت کی طرف سفر کا عنوان تھا اور جدیدیت گویا صورتوں سے متغیر صورتوں کی طرف حرکت کا نام ہے۔ روایت میں معنی اور معنویت صورت اور حقیقت کی باہمی نسبتوں سے جنم لیتی تھی جبکہ جدیدیت میں صورتوں کے باہمی ''افادی'' تعلقات معانی کے قوام قرار پاتے ہیں۔ معانی کی کل معنویت حقیقت سے نسبت کی بنا پر تھی۔ حقیقت اور صورت میں تعلق معانی کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اب معانی بھی بے معنی ہو گئے کہ اپنا کوئی ماورائی مبداء اور منتہاء نہیں رکھتے۔ جدیدیت نے صورت کی اساس پر ایک دنیا تخلیق کر کے دکھا دی ہے اور ہم اسی دنیا میں بستے ہیں۔ پھر ترقی کے نتیجے میں، وہ ترقی جو جدیدیت کی اساسی اقدار میں سے ایک قدر ہے، اور ٹیکنالوجی کی مدد سے تصویروں اور متحرک تصویروں کا ایک پورا نظام بنا کر کھڑا کر دیا ہے۔

تصویر کی حلت و حرمت کی فقہی بحوث سے قطع نظر اگر اس کی مابعد الطبیعیاتی اور وجودی اساسات اور نفسیاتی اور انفسی نتائج پر غور کیا جائے تو ایک ہولناک اور کریہہ تصویر بنتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہماری دینی روایت لفظ مرکز ہے صورت مرکز نہیں۔ صورت مرکزیت اپنے سوا کسی کی مرکزیت کو برقرار نہیں رہنے دیتی۔ تصویروں کی یلغار نے انسان کے فطری اقتضاء یعنی مقامِ تمکین کے حصول اور قلب کو حرکت و تغیر سے ثبات و رباط کی طرف لے کر جانے کی خلقی آرزو کو گویا ناممکن الحصول بنا کر رکھ دیا ہے۔ صورت پرستی کے ہمہ گیر تسلط نے حق و خدا پرستی کے امکانات کو بہت حد تک گھٹا دیا ہے۔ صورتوں کی چکا چوند نے حقیقت کو دھندلا دیا ہے۔ دکھائی دینا (Visibility) اب مصدقہ انسان ہونے کا اصول ہے۔ جو تصویر یا متحرک تصویر

کی صورت میں دکھائی نہیں دیتا وہ جیسے ہے ہی نہیں یا ہونے کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ یہ عالم ویسے ہی عالم صورت ہے۔ ہم سے تقاضا ہمارے خالق کی طرف سے جو بندگی کا کیا گیا ہے اس میں یہ متضمن ہے کہ اپنے وجہ قلب کو اس عالم صورت سے ورا عالم حقیقت کی طرف رکھیں یا اس سعی پیہم میں رہیں۔ جدیدیت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ٹیکنالوجیائی ترقی نے اس عالم صورت کی بھی تصویر کو اس عالم سے زیادہ زندہ، حقیقی اور زندگی بخش قرار دے دیا ہے۔ یہ عالم صورت بھی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی واضح نشانیاں اپنے ہاں رکھتا تھا مگر اس عالم کی تصویر ان نشانیوں سے بالکل عاری ہے کیونکہ وہ ایک ایسے انسان نے بنائی ہے یا کھینچی ہے جو کسی ماورائی حقیقت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔ اب ایسی دنیا بنائی گئی ہے کہ وہ تصویر زیادہ حقیقی، زیادہ مکمل اور زیادہ پرکشش لگنے لگی ہے۔ گویا یہ حقیقت سے دوگنی دور ہے کیونکہ یہ جس کی تصویر ہے وہ خود حقیقی نہیں۔

ہم سے مطالبہ صعود اور ترفع کا تھا مگر عملاً ہم نے نزول کیا ہے کہ اسی کو ترقی کا نام دے ڈالا ہے۔ روایتی معاشروں میں جسے صورت یا فطرت پرست کہا جاتا تھا جدید انسان وہیں تک اگر پہنچ پائے تو گویا اس نے ایک بڑا معرکہ سر کر لیا حقیقی ترفع اور صعودی حرکت کا آغاز تو اس کے بعد ہوگا۔ ٹیکنالوجیائی ترقی نے ہمارے ہاتھوں میں ایسے نشہ آور آلے تھما دیے ہیں کہ وہ تصویروں اور متحرک تصویروں والی دنیا جو حقیقت سے گویا اک دوگنی دوری پر ہے ہر انسان کی دسترس میں ہے اور وہ جب چاہتا ہے پلک جھپکتا نہیں ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ جیسے بیک وقت دو دنیاؤں کا باسی ہوتا ہے یا اس کی دنیا ان دو عالموں سے مل کر بنتی ہے جس کا غالب حصہ اسی تصویروں اور متحرک تصویروں والے عالم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اخفاء وخمول میں، جو روایتی مذہبی انسان کی ایک اساسی قدر تھی، جسم کا اخفاء، ذاتی اور خانگی معاملات کا اخفاء، نیکی اور گناہ کا اخفاء، بہت سے خیالات کا اخفاء شامل ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک کا برملا اور کھلا اظہار ایک مناسب اور نارمل رویہ سمجھا جاتا ہے۔ ادراک اور اظہار کے امکانات کا ایک پورا سمندر انسان کی جیب میں ہر وقت موجود ہوتا ہے وہ جب چاہتا ہے جس چیز کا چاہتا ہے اظہار کر دیتا ہے۔ اظہار نہ کرے تو اپنے آپ کو کٹا ہوا اور تنہا محسوس کرتا ہے کیونکہ دوسروں کے اظہارات کا ادراک اسی آلے کے ذریعے تو وہ کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں اخفاء کی قدر بھلا کیسے پہچانی جائے گی؟ روحانی ترفع کیسے ممکن ہوگا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو سنجیدہ توجہ کے طالب ہیں۔

تفہیم دین

پروفیسر عاصم حفیظ

ترکی میں اسلامی تبدیلی کیسے آئی؟

خودکفیل دینی مدارس، اعلیٰ معیارِ زندگی اور دینی طبقے کا کردار

کیا پاکستان کے دینی عناصر اس سے کچھ سبق سیکھ سکتے ہیں؟

ترکی نے ایک سفر طے کیا ہے۔ ایک حد سے گزری سیکولر ریاست سے اسلام کے قریب آتے معاشرے کا سفر۔ بہت سی کمیاں ہوں گی اور ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے لیکن معاشرے کی ہیئت بدل چکی ہے۔ آیئے! وہاں کے ایک مدرسے کو دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کس طرح ترکیہ نے دین، قرآن، علماء، دینی طبقے اور تعلیم کو اپنے ہاں اہم ترین بنا دیا۔

یہ ایک مدرسے کا منظر ہے۔ یہ صرف تعلیم کا مرکز نہیں بلکہ ایک مکمل کمپلیکس ہے۔ اس کے کمرشل پروجیکٹس ساتھ ہیں۔ ایک پیٹرول پمپ ہے۔ ایک ہوٹل ہے۔ ایک بڑا شاپنگ مال ہے۔ وسیع وعریض رقبہ ہے۔ سامنے اساتذہ کی شاندار رہائش گاہیں۔ ان کے سامنے کھڑی بہترین گاڑیاں بھی انہی علماء واساتذہ کی ہیں۔ طلبا کے لیے سہولیات سے مزین ہاسٹلز ہیں، کھانے کا بہترین انتظام ہے اور دیگر سہولیات جو کسی جدید ترین تعلیمی ادارے میں ہو سکتی ہیں۔ ڈیجیٹل لائبریریاں ہیں۔ جو طلبا و طالبات حفظ القرآن مکمل کریں گے تو اعلیٰ ترین حکومتی عہدیدار حتیٰ کہ صدر، وزیر اعظم، گورنرز اور وزراء تقریب میں حاضر ہوں گے۔ جو بچے ان دینی مدارس میں اعلیٰ کارکردگی دکھائیں گے انہیں جدید سائنسی تعلیمی اداروں میں بھی داخلہ دیا جائے گا اور انعام میں عمرہ ادائیگی کے لیے بھی بھیجا جائے گا۔ یہ ادارے خودکفیل ہیں۔ جی ہاں یوں بدلا ہے ترکی نے اپنے معاشرے کو۔ سب سے بہترین کیریئر بنا دیا ہے دینی تعلیم کو اور کسی بھی دینی پراجیکٹ میں کام کرنے کو۔ ذہین نوجوان اس طرف مائل ہوئے جنہیں معزز معیارِ زندگی دیا گیا۔ انہوں نے محنت اور کارکردگی سے معاشرہ بدل کر رکھ دیا۔ جب ننھے بچے اور نوجوان سب بہترین سہولیات، تعلیمی مواقع، انعامات، پزیرائی اور شاندار ملازمت، کیریئر، رہائشی و

دیگر سہولیات دیکھتے ہیں تو اس معزز و مقدس پیشے سے جڑ جاتے ہیں۔

یہ ترکی کے بدلنے کی ایک جھلک ہے۔اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں کہ ان کے ہاں بدترین زلزلے میں کئی کئی دن بعد نکلنے والے، زندگی کی آخری سانسیں لینے والے بھی رب کو پکارتے، دعائیں پڑھتے اور مضبوط ایمان کا مظاہرہ کرتے پائے جاتے ہیں۔

ہمارا عروج وہی تھا جب دینی مدارس اور تعلیم وتحقیق کے مراکز اور دیگر مقاصد کے لیے وقف (Trust) بنا کرتے تھے جن کی مستقل آمدنی سے یہ پراجیکٹ چلتے تھے۔مغرب کا ماڈل بھی یہی ہے اور ترکی، انڈونیشیا اور ملائیشیا نے بھی یہی اپنایا۔ ہمارے ہاں اب ایسا نہیں ۔ یہاں مستقل صدقات، خیرات، زکوۃ کی اپیل کا ماڈل چل رہا ہے۔ ہمہ وقت فنڈ ریزنگ ۔جس سے سلسلے جاری تو رہتے ہیں لیکن کوئی طویل مدتی پلاننگ نہیں کی جاسکتی۔ بہت ہی اچھے ادارے، شاندار دینی پراجیکٹس بڑے ہی ذوق وشوق سے بنائے جاتے ہیں۔ ابتداء میں بڑھ چڑھ کر تعاون بھی کیا جاتا ہے لیکن پھر سب کچھ بدلنے لگتا ہے۔ ان مدارس، دینی پراجیکٹس کے منتظمین اپنے مشن، تعلیمی وتحقیقی، انقلابی سرگرمیوں کی بجائے اخراجات کی فکر میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور بہت سے سلسلے اور پراجیکٹس انتہائی محدود ہوجاتے اور بعض اوقات بند ہوجاتے ہیں۔

ہمارے ہاں کے دینی مدارس و دینی پراجیکٹس نے انتہائی محدود وسائل، بغیر کسی حکومتی سرپرستی اور شدید مشکلات کے اور ہر قسم کی رکاوٹوں کا مقابلہ کرکے معاشرے میں اسلامی و دینی جھلک برقرار رکھی ہے لیکن سوشل میڈیا اور ٹیکنالوجی کے اس تیزی سے بدلتے ہوئے دور اور نئے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی صف بندی کی بھی ضرورت ہے۔نئی نسل کے لیے اس شعبے کو پرکشش بنانا ہوگا تاکہ معاشرے کے قابل لوگ اسے بطور کیریئر اپنائیں۔معاشرہ ہر سال مجموعی طور پر اربوں روپے دینی طبقے کے حوالے کرتا ہے۔ جسے علماء کرام، سکالرز اپنے ہاتھوں سے جلسوں، ریلیوں، تقریبات، تعمیرات، تعلیم وتدریس وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔ جدید چیلنجز کے مطابق دینی طبقے کو ان وسائل کا بہترین استعمال سیکھنے کی ضرورت ہے۔

تزکیۂ نفس

ڈاکٹر محمد امین

تصوف کی تجدید۔ضرورت، اہمیت اور طریق کار

القادر یونیورسٹی پراجیکٹ میں عالمی تصوف کانفرنس سے بطور مہمان خصوصی مدیر البرہان کا خطاب

قرآن کے تصورِ تزکیۂ نفس کی تشکیلِ نو ناگزیر ہے

القادر یونیورسٹی پراجیکٹ سوہاوہ کے شعبہ علوم اسلامیہ نے ۸، ۹ مارچ ۲۰۲۳ء کو عالمی تصوف کانفرنس منعقد کی۔ اس میں راقم نے مندرجہ بالا موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تصوف وہ اجتہادی ادارہ ہے جو مسلمانوں نے تزکیۂ نفس کے لیے قائم کیا تھا۔ صدر اوّل میں فتوحات کی سرعت، مال و دولت کی فراوانی، اسلام قبول کرنے والوں کی کثرت اور اس کے مقابلے میں وسیع پیمانے پر تربیتی سرگرمیاں نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں میں اخلاقی ابتری کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تو تابعین میں سے حضرت حسن بصریؒ اور حضرت ثابت بنانیؒ جیسے بزرگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی۔ شروع شروع میں یہ لوگ زُھّاد اور بکّائین کہلاتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ تزکیہ و تربیت کے لیے ایک مرکز کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو جس طرح تعلیم کے لیے مساجد کے ساتھ مدارس وجود میں آنے لگے تھے، اسی طرح تربیت کے لیے زادیے/ رباط/ خانقاہیں وجود میں آنے لگیں جن میں بالعموم مدرسہ بھی ساتھ ہوتا تھا کیونکہ مربی، مزکی اور مصلح حضرات بالعموم دین کے باقاعدہ عالم ہوتے تھے۔ یہ مراکز عموماً شہر کی ہماہمی سے دور قائم کیے جاتے تھے اور جو لوگ وہاں کچھ مدت کے لیے جاتے تھے، ظاہر ہے انہیں رہائش اور طعام کی بھی ضرورت ہوتی تھی جس کے لیے معاشرے کے اصحاب ثروت، تجار، وزراء وغیرہ آگے آئے اور یوں مسلم معاشرے میں زاویوں/ رباطوں/ خانقاہوں کا جال بچھتا چلا گیا۔

ان مراکز کا ہدف ایک ہی تھا کہ لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے۔ یہ ایک طرح کا ریفریشر کورس ہوتا تھا جس میں آنے والوں کو عبادت اور ذکر کی تلقین کی جاتی تھی، آخرت کی تذکیر کی جاتی تھی اور اسلامی زندگی گزارنے کی نصیحت کی جاتی تھی۔ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے صدیوں تک ان اداروں سے استفادہ کیا اور انہیں یہاں سے تزکیۂ نفس میں مدد ملی۔

رفتہ رفتہ ان کوششوں نے ایک تخصص کی صورت اختیار کر لی اور مخصوص الفاظ و اصطلاحات

میں بدلتے گئے جیسے مربی ومزکی ''مرشد'' کہلانے لگے۔ طالبانِ اصلاح کو''مرید'' (جمع مریدین) کہا جانے لگا۔ مرشد نے مریدین سے نبی کریم ﷺ کے اتباع میں اصلاح کی ''بیعت'' لینا شروع کردی۔ اصلاح کا مسلک اختیار کرنے والے کو''سالک'' اور اصلاح کے اسلوب اور طریقے/طریق کو''طریقت'' کہا جانے لگا۔ صفائے قلب کے خواہاں افراد کو''صوفی'' کہا جانے لگا اور صفائے قلب کے اس ادارے کو لوگوں نے''تصوف'' کہنا شروع کردیا۔ اس طرح تصوف بتدریج ایک مخصوص ادارہ بنتا چلا گیا لیکن اس میں کوئی چیز غیر شرعی نہ تھی۔

تصوف کے ادارے میں انحطاط

عرصے تک بہترین خدمات انجام دینے کے بعد یہ ادارہ بھی مسلمانوں کے دوسرے کئی اداروں کی طرح زوال پذیر ہوگیا۔ اس کے اسباب ومظاہر مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ غیر اسلامی افکار کی آمیزش خصوصاً یہودی، ہندی، ایرانی سِرّیت (Mystacism) کے اثرات جیسے حلول، وحدۃ الوجود کا فلسفہ اور انا الحق کے نعرے۔

۲۔ غیر اسلامی رسوم ورواج جیسے تصورِ شیخ یا مرشد کو سجدہ کرنا اور بقول شاعر۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زِ راہ ورسمِ منزل ہا

یعنی اگر پیر مغاں کہے تو نماز کے سجادے (اردو میں مصلّٰی) کو غرق شراب کردے کہ سالک آخر طریقت کے راہ ورسم سے بے خبر کیسے ہوسکتا ہے؟

۳۔ تصوف میں افراط وتفریط کا پیدا ہوجانا۔ افراط کی مثال یہ ہے کہ بعض صوفیاء نے یہ سمجھنا شروع کردیا کہ علم باطن، طریقت اور دین کا مغز تو ہمارے پاس ہے اور علماء شریعت کے پاس صرف ظاہری اعمال ہیں جو حقیر ہیں رومی کا شعر ہے۔

ما زِ قرآں برگزیدم مغز را
استخواں پیشِ سگاں انداختیم

یعنی ہم نے قرآن کا مغز لے لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے پھینک دی ہیں۔ اس سے احکام شریعت سے غفلت اور اس کی عدم اہمیت کا تصور ابھرا۔ دوسری طرف تفریط نے جنم لیا اور حنابلہ وسلفیہ نے تصوف کے رد پر کمر کس لی اور عصر حاضر کے متجددین نے اسے متوازی

دین کہنا شروع کر دیا۔

۴۔ رہبانیت کے اثرات اور صوفیاء کا آبادیوں کو چھوڑ کر عبادت وریاضت کے لیے جنگلوں اور پہاڑوں کا رُخ کرنا اور تہذیبِ نفس کی بجائے نفس کُشی کا رجحان جیسے کھانا پینا، بولنا اور لباس پہننا ترک کر دینا وغیرہ۔

۵۔تصوف کو وراثت، سجادہ نشینی اور کاروبار بنالینا۔یوں یہ عظیم اور نازک کام علماء و مصلحین کی بجائے جہلا کے ہاتھوں میں چلا گیا۔

ہمارے عہد میں تصوف سے مراد ہے نوٹ اور ووٹ دونوں یعنی صوفیوں کی روایتی گدیاں سیاسی اقتدار، دنیاداری، دولت اور جاہ ومنصب کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔

۶۔ تصوف کے غیر اسلامی افکار اور غیر اسلامی رسوم ورواج کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے لوگ تصوف کے ردّ میں بہتے ہوئے تزکیۂ نفس کے قرآنی تصور اور منہج سے بھی غافل ہو گئے۔

۷۔ اور بعض نے دین کا ایسا تصور پیش کرنا شروع کر دیا جس میں عبادات واذکار کا استخفاف تھا اور عبادت کی بجائے صرف اطاعت پر زور تھا۔

۸۔ اقبال نے مسلم زوال میں تصوف کے کردار کو ایک شعر میں سمیٹ دیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سُلطانی و مُلّائی و پیری!

پیری سے ان کی مراد ہے دورِ متاخرین کا تصوف، مُلّائی سے مراد ہے علماء کا تقلید وجمود کا رویہ اور سلطانی سے ان کا اشارہ ملوکیت اور سیاسی عدم استحکام کی طرف ہے۔

۹۔ ابتداء میں تصوف کا نام نہ تھا لیکن کام موجود تھا اور علماء وصلحاء تزکیۂ نفس کا کام کرتے تھے۔ پھر تصوف کا نام سامنے آیا اور تزکیہ کا کام بھی کچھ نہ کچھ ہوتا رہا۔ آج کل صرف نام رہ گیا ہے اور کام ختم ہو گیا ہے۔

تجدید کا اسلوب

مندرجہ بالا نکات سے ظاہر ہے کہ تصوف کا ادارہ اپنی موجودہ صورت میں شرعاً قابل

قبول نہیں رہا اور اس کی تجدید اور اوور ہالنگ کی شدید ضرورت ہے۔ ہماری رائے میں اس کی تجدید کا اسلوب اور اس کے عناصر مندرجہ ذیل ہونے چاہئیں:

۱۔ قرآن وسنت کو معیار مانا جائے اور انہیں ماخذ بنایا جائے۔

۲۔ امت کے بارہ سو سالہ تجربات کے صالح عناصر لے لیے جائیں اور غیر اسلامی اور کمزور پہلو ترک کر دیے جائیں۔

۳۔ عصری ذہن (Contemporary Mind set) کی تکوین وتشکیل اور مشکلات کا لحاظ رکھا جائے کیونکہ مسلم معاشرے میں مغرب کی غالب تہذیب کی وجہ سے مادہ پرستی اور عقلیت کا غلبہ ہو چکا ہے۔

۴۔ مربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدیم وجدید کا جامع ہو یعنی ایک طرف ماضی کے محقق اور باشرع صوفیاء کے مناہجِ اصلاح میں مہارت رکھتا ہو تو دوسری طرف جدید فلسفہ وعلم النفس کا بھی شناور ہو۔ اور وہ مروجہ تصوف کی خرابیوں سے پاک ہو خصوصاً مالی لحاظ سے عفیف ہو۔

۵۔ تصوف کی بجائے تزکیۂ نفس پر زور دیا جائے اور دین میں اس کی اساسی حیثیت واضح کی جائے۔

۶۔ مربی کے لیے دین کا عالم ہونا ضروری ہے کہ ہماری رائے میں کارِ اصلاح ایک نوع کا اجتہادی عمل ہے۔ نیز مربی کا ذہین وفطین اور ماہر علم النفس ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اس میں Generalized فارمولے کام نہیں آتے بلکہ ہر فرد ایک منفرد شخصیت رکھتا ہے اور اس کا علاج نفس دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔

۷۔ تربیت گاہوں کے روایتی رسوم ورواج کا ترک ضروری ہے اور تعلیم وتربیت کے اسلوب پر نظر ثانی کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ہماری طالب علمانہ رائے میں عصر حاضر میں قرآنی تزکیۂ نفس کے احیاء اور روایتی تصوف کی تجدید کے لیے مذکورہ بالا نکات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

تبصرۂ کتب　　اوریا مقبول جان

Big Capital in an Unequal Word
By Rosita Armytage
The Micropolitics of Wealth in Pakistan
[پاکستان میں بائیس لاکھ لوگوں نے بائیس کروڑ عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے]

کسی زمانے میں پاکستان میں نعرہ لگایا جاتا تھا کہ پاکستان کی دولت پر بائیس خاندانوں کا قبضہ ہے۔آج نصف صدی گزرنے کے بعد اب ان بائیس خاندانوں کا دائرۂ اثر بڑھ کر اس ملک کی ایک فیصد آبادی تک پھیل چکا ہے۔یعنی بائیس کروڑ لوگوں کی آبادی میں سے بائیس لاکھ لوگ ایسے ہیں جو اس ملک کے نوے فیصد سے زیادہ سرمائے پر قابض ہیں۔اس کیفیت کو دنیا بھر میں "Elite Capture" یعنی اشرافیہ کی لوٹ کھسوٹ کہتے ہیں۔یہ اصطلاح گزشتہ دو دہائیوں سے پاکستان میں مسلسل استعمال کی جارہی ہے لیکن اس ''اشرافیہ کی لوٹ کھسوٹ'' پر ایک خالصتاً تحقیقاتی کام آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی کے علم بشریات (Anthropology) ڈیپارٹمنٹ کی ڈائریکٹر ڈاکٹر روزیٹا آرمیٹج (Rosita Armytage) نے کیا ہے۔اس نے اپنی چودہ ماہ کی تحقیق کے بعد ایک کتاب تحریر کی ہے جس کا نام ہے: *"Big Capital in an Unequal Word"* یعنی ''غیر مساوی دنیا میں سرمایہ کی فراوانی''۔کتاب کا ذیلی عنوان ہے *"The Micropolitics of Wealth in Pakistan"* یعنی ''دولت کی پاکستانی سیاست میں کارستانیاں''ڈاکٹر روزیٹا نے اپنی تحقیق کے لیے موضوع کا انتخاب کرتے وقت یہ ارادہ کیا کہ وہ پاکستان جیسے ملک کی مڈل کلاس کے بارے میں تحقیق کرے گی۔اس کی وجہ اس کے آسٹریلیا میں موجود پاکستانی دوست اور ساتھ کام کرنے والے افراد تھے جو مڈل کلاس سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ان کی وجہ سے ہی وہ پاکستان کی مڈل کلاس پر تحقیق کرنے کے لیے پاکستان آ گئی لیکن اس کے بقول،اسلام آباد سے لاہور تک کے ایک سفر نے اس کا ارادہ یکسر بدل دیا۔اس نے بتایا کہ میں نے اپنی تحقیق کے دوران اسلام آباد سے لاہور کی ایک یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ سے ملنے جانا تھا اور اس کے لیے میں نے ایک آرام دہ بس کا ٹکٹ بھی لے لیا تھا،لیکن میری ایک دوست نے مجھے کہا کہ تم

میرے فلاں دوست کی گاڑی میں سفر کرو۔ ایک آرام دہ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے، روزیٹا نے اس شخص سے اس کی زندگی، خاندان اور کاروبار کے متعلق سوالات پوچھنا شروع کر دیئے۔ جوابات سے ایک حیران کن کہانی سامنے آئی اور اسے پاکستان کی ایک ''کلاس'' کے نیٹ ورک کا اندازہ ہونے لگا۔ اس شخص کا خاندان سگریٹ بنانے کے کاروبار سے منسلک تھا اور اس کے خاندان کے افراد، ''انکل''، ''کزن'' اور دیگر افراد کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تھا جو چین کے ساتھ بھی تجارت کرتے تھے اور اس دوران وہ مختلف مراحل سے گزرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہم سے کچھ عرصہ پہلے کتنی بڑی رشوت مانگی گئی تھی۔ روزیٹا بتاتی ہے کہ اس گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ پاکستان میں اشرافیہ اور سرمایہ داروں کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک ہے جو ملکی سیاست، کاروبار اور معیشت پر چھایا ہوا ہے اور اس طبقے پر اسے تحقیق کرنی چاہیے۔ اس کے چند دن بعد ہی وہ ایک بہت بڑے صنعتکار، اس کے بھائی، کزن، ان کے ایک ایسے خاندانی دوست کے ساتھ بیٹھی تھی جو لاہور کے بہت اہم سیاست دان کا بیٹا تھا۔ ان سب نے مل کر روزیٹا کے لیے تین صفحات پر مشتمل پاکستان کے امیر ترین صنعت کاروں، کاروباری حضرات اور طاقت ور سرمایہ داروں کی ایک فہرست مرتب کی جن سے اسے اپنی تحقیق کا آغاز کرنا تھا۔ یہ فہرست آہستہ آہستہ طویل ہوتی گئی اور چودہ ماہ کی تحقیق کے بعد وہ یہ کتاب لے کر سامنے آئی جس کے مطابق پاکستان کی ایک فیصد اشرافیہ اس ملک کی معیشت، حکومت اور سیاست پر قابض ہے۔

پاکستان کی ایک فیصد اشرافیہ گذشتہ چالیس سال کے عرصہ میں صرف بائیس خاندانوں سے بائیس لاکھ تک کیسے پہنچی؟ دولت کی یہ پیوند کاری کیسے ہوئی اور یہ فصل اتنی ثمر بار کس طرح ہوگئی؟ ڈاکٹر روزیٹا کا تحقیقی مطالعہ پاکستان میں ارتکازِ دولت اور استحصالی طبقات کے مختلف طریقِ ہائے کار سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ اس کے مطابق یہ ایک خوفناک گٹھ جوڑ ہے جو اعلیٰ سطح کے بیوروکریٹس، فوجی جرنیلوں، سیاسی رہنماؤں اور کاروباری اشرافیہ کے درمیان وقت کے ساتھ ساتھ مستحکم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یوں تو ہر گروہ کے اپنے اپنے طاقت کے مراکز (Power Blocks) ہیں لیکن مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے یہ تمام گروہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہ طاقت کے مراکز فوج، سول بیوروکریسی، بزنس اور سیاست میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تمام لوگ

اپنے اپنے گروہوں میں انفرادی طور ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے معاملات میں اکثر اوقات کبھی مداخلت نہیں کرتے۔ انفرادی سطح پر یہ اپنے تعلقات کے حوالے سے کسی جاننے والے یا رشتے دار کی مدد ضرور کرتے ہیں لیکن دوسرے گروہ کی حدود کا احترام کرتے ہیں۔ یہ دوسرے کے مضبوط ''قلعے'' میں کبھی نقب زنی نہیں کرتے۔ ان کا آپس کا گٹھ جوڑ ایسا ہے کہ ایک گروہ کو باقی تمام گروہ مل کر تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یہ سب مل کر اشرافیہ بنتی ہے جو پاکستان کی سمت کا تعین کرتی ہے، ایسے قوانین بناتی ہے جن سے اس کے ممبران خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنے آپ کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چاروں گروہ اس قدر ''خوش بخت'' ہیں کہ پاکستان میں کسی بھی قسم کی آفت، مصیبت، جنگ یا بیماری آ جائے، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوتا۔

یہ 1971ء کے بہت بڑے سانحے سے بھی صاف بچ نکلے۔ سرمایہ کاروں کا سرمایہ محفوظ رہا، بیوروکریٹس کی نوکریاں چلتی رہیں، فوجیوں کی پروموشنیں ہوتی رہیں اور سیاست دان بھی ویسے کے ویسے دودھ کے دُھلے نظر آتے رہے۔ گھر، کاروبار تو غریب بنگالیوں اور بہاریوں کے اُجڑے۔ جان سے عام لوگ گئے، نسلیں ان کی برباد ہوئیں۔ اس سانحے میں اشرافیہ کے تحفظ کی مثال صرف ایک اصفہانی خاندان سے واضح کی جاسکتی ہے۔ مرزا ابوطالب اصفہانی کو 1799ء میں انگریز نے لندن بلا کر رچمنڈ کے علاقے میں جائیداد ''عطا'' فرمائی اور پھر جب ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے سراج الدولہ کے جرنیل میر جعفر کی غدّاری سے بنگال فتح کیا تو پھر اپنے ''لاڈلوں'' کو یہاں لا کر آباد کیا جانے لگا۔ یوں اصفہانی خاندان لندن سے آ کر یہاں آباد ہو گیا اور چائے کا کاروبار کرنے لگا جس کی وسعت پورے برصغیر اور پھر دنیا بھر میں پھیل گئی۔ متحدہ پاکستان تک اصفہانی چائے مغربی پاکستان میں بھی مقبولِ عام برانڈ تھا۔ پاکستان بننے کے بعد یہ خاندان کلکتہ سے چٹاگانگ منتقل ہو گیا جس کی پہاڑیوں پر چائے کے وسیع باغات تھے۔ مشرقی پاکستان میں بنگالیوں، بہاریوں اور دیگر قومیتوں پر 1971ء میں کیا کیا مظالم نہیں ٹوٹے، لیکن اصفہانی خاندان کی کاروباری سلطنت کو اس سانحے کے دوران بھی تحفظ فراہم کیا گیا۔ روزیٹا کے مطابق یہ تمام طبقات قوانین تو بناتے ہیں، مگر ان میں سے ایسے راستے نکالتے ہیں تا کہ انہیں اپنے ہی بنائے ہوئے ان قوانین پر عمل نہ کرنا پڑے۔ قوانین

سے بالاتر ہونے کی یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ دن بدن امیر سے امیر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور خوفناک حد تک طاقت ور بھی۔

بائیس خاندانوں کے گروہ کا بائیس لاکھ افراد کے جمِ غفیر میں ڈھلنے کے عمل کے اہم ترین راستے، طریقِ کار یا گٹھ جوڑ کا تذکرہ اس کتاب میں دو اہم اصطلاحات سے کیا گیا ہے۔ پہلا "Socialising and Marriages" معاشرتی میل جول اور شادیاں، دوسرا "Culture of Exemption" استثناء کا کلچر۔ شادیاں اور معاشرتی میل جول وہ زینہ ہے جس کے ذریعے یہ تمام گروہ بلندی کی منازل طے کرتے ہیں۔ روزیٹا لکھتی ہے کہ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ نوجوان فوجی افسران، صنعت کاروں کی بیٹیوں سے شادی کرنا پسند کرتے ہیں اور اعلیٰ بیوروکریٹس کی بیٹیاں بھی ایسے ہی سرمایہ دار اور صنعت کار افراد کو پسند کرتی ہیں اور سیاست دانوں سے کنارہ کشی (Shyaway) اختیار کرتی ہیں۔ اس کتاب کا ایک فقرہ غضب کا ہے، جسے ہو بہو انگریزی میں تحریر کر رہا ہوں تاکہ اس کا اصل لطف قائم رہے اور ترجمہ کرنے کے بعد اُردو قارئین بھی آگاہ ہوسکیں۔

"Marital strategies continue to be one of the most powerful mechanisms employed by the Pakistani elite to protect their economic assets and their social status, to foster inter-elite networks and to gather information on other elite families."

’’شادیوں کی حکمتِ عملی ایک ایسا طاقتور طریقِ کار ہے جسے پاکستان کی اشرافیہ مسلسل استعمال کرتی ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اپنے مالی اثاثوں اور معاشرتی رُتبے کا تحفظ کر سکے اور اس کے ذریعے اپنے اشرافیہ کے نیٹ ورک کی شاندار نشوونما کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے صاحبِ حیثیت خاندانوں کے بارے میں بھی اپنی معلومات میں اضافہ کرتی رہے‘‘۔

اس سارے کھیل میں پاکستان میں دو مختلف اقسام کی اشرافیہ پائی جاتی ہیں، جن کا آپس میں میل کچھ عرصہ پہلے تک مشکل سے ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ فرق تقریباً مٹ چکا ہے۔ پہلی قسم، قیامِ پاکستان سے قبل کی اشرافیہ کی ہے جو مغلوں اور پھر انگریزوں کی وفاداریوں کے عوض

مراعات حاصل کر کے مقام ومرتبہ پر صدیوں پہلے ہی فائز ہو چکی تھی۔اس اشرافیہ کے لیے یہ کڑوی گولی نگلنا مشکل تھی کہ وہ بعد میں امیر بننے والوں کو اپنے برابر سمجھیں۔روز یٹا نے اپنی کتاب میں ہمارے ملک میں زبان زدِ عام اصطلاح ''نودولتیے'' کا استعمال اس فرانسیسی نعم البدل "Nouveau Riche" کی اصطلاح سے کیا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ 1970ء کے بعد امارت کی بلندیوں کو اچانک چھونے والے خاندان اس قدیم اشرافیہ کی نظروں میں شروع شروع میں گھٹیا تصور ہوتے تھے۔قدیم اشرافیہ اپنے لیے مخصوص ''ٹھکانوں'' کے دروازے ان کے لیے بند رکھتی تھی، جیسے یہ لوگ جم خانہ جیسے بڑے کلبوں کی ممبر شپ نہیں لے سکتے تھے اور ان کی اولادوں کے لیے ایچی سن جیسے سکولوں میں داخلہ مشکل سے ہوتا تھا۔قدیم اشرافیہ، یہ روّیہ اس لیے اختیار کرتی تھی، کیونکہ ان پرانے ''خاندانی رئیس'' لوگوں کی آمدن وقت کے ساتھ کم ہورہی تھی اور وہ ان نودولتیوں کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر پاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی معاشرتی میل جول کی جگہوں سے انہیں دُور رکھتے تھے اور وہ آج بھی عموماً ایسا ہی کرتے ہیں۔لیکن اب کسی ایک خاندان کی دولت اور دوسرے خاندان کے مرتبے کو شادی کے ''اعلیٰ پیڈسٹل'' یا ''منچ'' پر یوں اکٹھا کر دیا جاتا ہے کہ ایک جرنیل کی طاقت وقوت، ایک بیوروکریٹ کی حیثیت و مرتبہ اور ایک عام سے خاندان سے تعلق رکھنے والے کسی نودولتیے پراپرٹی ٹائیکون، صنعت کار یا بزنس مین کی دولت کا یہ ایک حسین ملاپ بن جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی ایک فیڈرل سیکرٹری یا ایک جرنیل کا بیٹا یا بیٹی کسی ایسے ہی نودولتیے کے ہاں بیاہا جاتا ہے تو پھر وہ ایک ہی زقند میں دولت میں نہانے لگتا ہے اور نودولتیا خاندان اس مرتبے، مقام اور سماجی حیثیت کا لطف اُٹھانے لگتا ہے جس کے بارے میں اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔اس غیر مقدس (Unholy) ملاپ کے نتیجے میں پاکستان کے معاشرے میں ایک ''معاشرتی استثناء'' پیدا ہو چکا ہے، جو اس اشرافیہ کو ہر جرم کی سزا سے مبّرا کر دیتا ہے۔اس ملک کے یہ بائیس لاکھ لوگ ہی تو ہیں جو اب ایک خاندان بن چکے ہیں اور جن کا شجرہ نسب بھی ایک ہے۔یہ آپس میں لڑتے ضرور ہیں مگر عوام کے مقابل یہ سب کے سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔یہ اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے وہ سانپ ہیں جن کے ہاتھوں میں لوٹی ہوئی دولت کے خزانوں کی چابیاں ہیں اور ان کے نتھنوں سے قوت و غلبے کی پھنکاریں نکل رہی ہیں۔

تبصرۂ کتب　آصف محمود ایڈووکیٹ

English Etiquette for Indian Gentlemen
by W.T.Webb

[آدابِ غلامی جو بذریعہ تعلیم نسل درنسل ہمیں سکھائے جارہے ہیں]

انگریز ادیبوں نے ہندوستانیوں کو آداب غلامی سکھانے کے لیے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں۔ان میں سے ایک تالیف مذکورہ بالا عنوان سے ڈبلیوٹی ویب کی ہے۔ یہ کتاب کم اور غلامی کی دستاویز زیادہ ہے۔اس میں ایک ایک کر کے مقامی لوگوں کو بتایا گیا کہ اب ان کا دور نہیں رہا، ان کی تہذیب پرانی ہوچکی۔ نئے آقا اب جو چاہتے ہیں انہیں اسی تہذیب کو اپنانا ہوگا۔ اس کتاب میں بعض مقامات پر واضح طور پر آداب غلامی سکھائے گئے ہیں۔تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ انگریز کے حضور حاضر ہونے کے آداب کیا ہیں، اس سے ملنے کے آداب کیا ہیں اور اس سے مخاطب کیسے ہونا ہے؟

مقامی یعنی ہندوستانی ڈیزائن کے جوتے پہن کر جانا ہے تو جوتے باہر برآمدے میں اتار کر اندر حاضر ہونا ہے۔ایسے جوتے پہن کر انگریز کے حضور حاضر ہونا اس کی توہین ہے۔ خبردار! سلام کے لیے اس وقت تک ہاتھ نہ بڑھایا جائے جب تک صاحب یا میم خود تمہیں اس قابل نہ سمجھیں۔کسی انگریز کو صرف اس کے نام سے نہیں پکارنا، القابات لگانا ضروری ہے۔کسی یورپی سے سرِراہ ملاقات ہوجائے تو ادب کے تقاضے کیسے پورے کرنے ہیں اور ان میں سے کسی کو مدعو کرنا ہو تو میزبانی کے آداب کیا ہوں گے؟ وغیرہ۔

مقامی تہذیب کو مکمل طور پر قصۂ پارینہ قرار دیتے ہوئے سونے سے جاگنے تک اور جاگنے سے سونے تک، ہر معاملے اور ہر لمحے میں انگریزی طور طریقے سکھائے گئے ہیں۔کھانا کیسے کھانا ہے؟ چھری کانٹا کیسے استعمال کرنا ہے؟ ہاتھ سے کھانا ایک برائی ہے۔خبردار جو کسی جنٹل مین نے گوشت ہاتھ سے کھایا۔انگریزوں کی حساسیت کا خیال رکھنے کا باربار "حکم" دیا گیا ہے لیکن مقامی لوگوں سے کہا گیا ہے کہ تمہاری بےعزتی ہوجائے تو برا نہ مانا کرو۔اور ہاں اگر تم معزز بننا

چاہتے ہو تو شادی کے دعوت ناموں میں چشم براہ جیسی فضولیات کی جگہ RSVP لکھا کرو۔

انگریز کو یہاں سے گئے آج پون صدی ہوگئی ہے لیکن ہمارے شادی کے دعوت ناموں سے RSVP ختم نہیں ہوسکا۔ ہم آج بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے معززین بننے کے چکروں میں ہیں۔

مقامی تہذیب واقدار کی تذلیل پر مشتمل عمومی ''ادب وآداب'' کے بیان میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ کتاب کے آخر میں درخواست لکھنے کے آداب لکھ کر پوری کردی گئی۔

باب نمبر گیارہ میں بتایا گیا ہے کہ درخواست، پٹیشن وغیرہ کیسے لکھی جائے اور ساتھ ہی نمونے کے طور پر کچھ درخواستیں اور پٹیشنز لکھی گئی ہیں کہ ان کو دیکھ کر 'مقامی جنٹل مین' رہنمائی حاصل کریں۔ ان تمام درخواستوں میں چند چیزیں اہتمام سے بتائی گئی ہیں۔

اول: درخواست کی شروعات انتہائی غلامانہ، فدویانہ اور ذلت آمیز انداز سے کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر I beg to say کا انداز سکول کے بچوں کی درخواست سے لے کر سرکاری عرضیوں تک ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے تا کہ سکولوں سے ہی بچے یہ سیکھ لیں کہ کہ آداب غلامی کیا ہوتے ہیں اور کیسے ایک دن کی چھٹی کی درخواست کا آغاز بھی Beg سے ہوتا ہے۔

دوم: ہر درخواست کے آخر پر Your servant، Your most obedient servant جیسے الفاظ لکھے گئے تھے تا کہ مقامی لوگوں کو یہ معلوم رہے کہ ان کی اوقات نوکر اور رعیت سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک پوری تہذیبی واردات تھی جو اس سماج پر مسلط کی گئی۔ چونکہ اہم مناصب پر پھر یہی 'مقامی جنٹل مین' فائز ہوئے اور نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے بعد یہی افسر شاہی ہمیں ورثے میں ملی اور کسی نے اس سماجی واردات پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس لیے یہ 'مقامی جنٹل مین' آج بھی 'انگریزی آداب' سے سماج کی پشت لال اور ہری کیے ہوئے ہیں۔

وکالت کے شعبے میں بھی وہی تذلیل دیکھی۔ جو انصاف مانگنے آتا تھا اسے سائل کہا جاتا تھا۔ سائل ہماری عدالتوں اور کچہری میں ہمیشہ عرض گزار ہی پایا گیا، انصاف مانگا نہیں جا سکتا تھا۔ سائل یہ مطالبہ نہیں کر سکتا تھا کہ انصاف دیا جائے، مگر ہاں وہ Prayer یعنی التجا اور درخواست پیش کر سکتا تھا۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۶۰)

Dr. Javead Akber Ansari

Truth about Democracy

Today almost all governance regimes – liberal, socialist, nationalist claim to be democratic. The only major exception is the Islamic Emirate of Afghanistan. Democracy is usually defined as "rule of the people, by the people, for the people". This is a dangerous half-truth.

Democracy has never been and can never be "rule by the people" – the people (*awam*) have always been ruled by elites. The people are necessarily those who are governed. The governed and the governors can never be one and the same entity. Similarly, a democratic regime can never be a rule of the people – the people as a whole cannot rule. It can, however, in certain circumstances, be rule for the people depending on who the people are. Similarly, democracy can be a rule "of" the people if be "of" we mean "over" the people.

Therefore, the correct definition of democracy is "rule by an elite over a people which may in circumstances be for the people".

The Historical Evolution of Democracy

The crucial term in our revised definition of democracy is "the people". Democracy originated in ancient Athens where by "the people" was meant the citizens of the state – the citizens were a small minority of the state's population which consisted mainly of slaves and aliens who had no role in the governance system. Democracy then disappeared as a model of governance after the collapse of the Roman republic in roughly the first century (CE) and reappeared about

twelve/thirteen hundred years later in some Italian cities and later in the market towns of what is now the Netherlands and Germany. In these cities "the people" who ruled over the merchants, bankers, craftsmen and guild participants again a tiny minority among the state's population. After the revolutions against absolute monarchy England (1688), France (1789), America (1776-83) democratic regimes were established in several countries. Up to the beginning of the twentieth century these also represented minority rule – "of the people" who had the franchise were capitalist property owners, landlords, merchants, industrialists and financers.

In America the establishment of democratic rule required the genocide of the vast majority of the continent's population – 80 million Red Indians were methodically slaughtered and dispossessed during three centuries. Adult white males were a tiny minority in seventeenth/eighteenth century America – they were the only citizens of the country.

Adult franchise was introduced in all capitalist countries – Europe, America, the USSR and China – and in most colonies during the twentieth century. In the twentieth century "representative government" came to mean representation of the entire population of a state for the first time in history.

Democracy as a Tool of Capitalist Governance

All capitalist states – America, the erstwhile Soviet Union, China, India – are representative democracies. Methods of representation vary but the principle is the same. This principle is embroiled in the presumption that every adult person in the state is a capitalist individual – the assumption that capitalist individuality has been universalized. It no longer remains confined to those who "own" capitalist estates

– the financers, the industrialists, the state bureaucrats, the intellectuals. Every individual in expected to regard his body and soul – and its associated labor power – as capital assets subsumed in capitalist property (as Locke argued in the early eighteenth century).

The representative democratic state is a regime for the "people" – provided all the people of a state are capitalist individuals. This means that in the eyes of such a people the sole or main purpose of existence is the maximization of capital accumulation. The dedication of body and soul of the single dominant people to capital accumulation is known as rationality.

A capitalist individual is autonomous – self-determined – but autonomous only to the extent to which he/she is rational. He/she obeys the commands of his baser self – *Nafs Ammara* – and admits of no criterea for evaluating the moral worth of it's command except the principle of universalizability – it is legitimate for him/her to do what his/her *Nafs Ammara* desires provided this act does not inhibit other capitalist individual from doing what their *Nafs Ammara* desires. This is how rationality rules autonomy. The capitalist individual is a beast – but a rational beast who respects the capitalist rights of other beasts to fulfil the commands of their *Nafs Ammara*.

The Democratic Governance Process

Representative democracy provides mechanisms for the articulation/interpellation of the desires of (presumed) universalized capitalist individuality. Presumed capitalist men and women have the right to choose and censor sections of the elite (usually organized in political parties or their factions) who legislate to further particular interests but this legislation

is invariably constrained by a constitution which ensures the rule of law – i.e. the rule of law of capital.

That is why the role of the representational bodies – municipal, provincial, federal – remains limited to legislation. The implementation of the legislation in all capitalist democratic regimes is the domain of non-representative bodies – the judiciary, the administration, the police and army, the corporate and financial sectors, the media and entertainment industries. These non-representative executive institutions are peopled by cadres chosen in all democratic states on the basis of their internalization of capitalist knowledge (*Jahaliyat-e-Khalsa*). So the modus vivendi of all these non-representative capitalist state authorities is rational. They function (through law, prosecution and coercion) to impose (presumed) rational constraints on the (presumed) autonomy of capitalist individuals.

Representative democracy is always the rule of capital. It is the capitalist disciplining (in a Foucaldian sense) of capitalist governance process. It is a means for the imposition of the efficiency demands of rationality upon the desires for autonomy.

But attempts at such subjectification are not always successful. First because subjectification the spirit (*ruh*) to the *Nafs Ammara* goes against man's nature – the *ruh* is the command of Allah, naturally seeking identification is *abdiyat* – autonomy is a denial of the fundamental relation of being to Being. Autonomous subjectivity deprives being of the capacity to love (for love is necessarily the rejection of autonomy/self determination). Leading a wholly loveless life is literally impossible for mankind. Hence the production and sustenance of capitalist individuality is inherently problematic

and men and women often act irrationally (heteromoniously).

Secondly rationality is *Jahliyat-e-Khalisa*. It can never identify a unique policy path to operationalize universalizability. There exists no possibility for identifying a correct method for the maximization of the rate of accumulation of capital in general. Strategies of capital accumulation always articulate particular interests and perspectives – and choices among them are always necessarily irrational. Particular interests always and necessarily override the common interest in capitalist politics due to the inevitable "unknowability" of a presumed "common interest" is the basic source of never ending endemic capitalist systemic crises.

The Islamic Revolutionary Response

We are Islamic revolutionaries. We are not idealists. We are not pragmatists. We recognize that the Islamic revolutionary strategy is contextualized within a global capitalist order – a global *Dar-al-Harb*. Islamic revolutionaries seek to implode capitalist order by intensifying its inherent contradictions. Imploding the democratic governance process requires the following initiatives.

First, we must seek to foster and strengthen non-autonomous, non-rational individuality at the mass level. We must seek to intensify religious and spiritual consciousness. جاگ سوزِ عشق جاگ

The promotion of Islamic culture, traditions, rites and rituals is of central concern to Islamic revolutionaries. We must draw close to the traditional *maslaki* circles and spritiual *peers* and *mashaikhs* who throughout our history have been the spiritual and religious *murshids* of our masses. It is they

who have provided and promoted Islamic culture and tradition at the mass level and laid the foundation for the promotion of Islamic individuality.

Second, we must seek to organize the masses under the leadership of the *mashaikh*, the *peers*, the *ulema* and the mosque *imams*. We must seek to revive and strengthen the systems of *hidayat* which have traditionally characterized our tribal, *baradari* and *mohalla* life. This is a method for de-democratizing society dis-empowering and deconstructing capitalist/civil society) and for creating a state within a state.

Third, we must seek to push back the circuit of capital through the creation of a *tamveeli* system which integrates the hundreds of thousands of *halal* businesses (businesses which have no transnational links with the money and capital markets) spread throughout the country. Freeing the masses from capitalist employment can serve as a prime means for reducing the ability of the market role of social governance. The emergence of a dynamic and vibrant undocumented halal economy can also serve as a means for reducing national dependence on imperialist commodity and financing supply chains.

Fourth, the electoral process should be used to deconstruct democratic governance. This requires a) grass roots level unity among the major Islamic parties b) supported by major Islamic non-political organization c) on the basis of an exclusively Islamic electoral agenda d) seeking an enhancement of the governance capability of the mosque/*mohalla/bazar* based local governance structures that have been created through a social institutionalization strategy.

The electoral organization of social/political consensus

building is an exploitable weakness especially of liberal democratic systems. It presumes the universalizability of capitalist (rational, autonomous) individuality. Empowering of non-capitalist (non-autonomous, non-rational) individuality through electoral mechanisms can subvert the democratic process (this suggests a "negation of the negation" in Hegelian terms) as has been effectively shown in Iran.

For the effective use of the electoral mechanism to subvert the democratic process the crucial requirement is the sustenance, social reproduction and political empowerment of non-autonomous, non-rational, non-capitalist individuality.

بقیہ: ***English Etiquette for Indian Gentlemen***

میں بیٹھ کر سوچتا کہ اگر عدالت بنی ہی انصاف دینے کے لیے ہے اور اگر اللہ کا حکم ہے کہ "انصاف کرو کہ یہ تقوی کے قریب تر ہے" تو پھر اس بنیادی انسانی حق کے حصول کا مطالبہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ گڑگڑاتے لہجوں میں مسکینی طاری کر کے Prayer کیوں کی جاتی ہے بلکہ باوقار طریقے سے ڈیمانڈ کیوں نہیں کی جاتی؟

اس جنٹل مینی کے خلاف پہلی آواز دلی سے اٹھی۔ لعل گوردتج نامی ایک مداری دلی کے چوراہے میں بندر لے کر آتا اور ڈگڈگی بجا کر اسے کہتا: جنٹل مین بن کے دکھا۔ لعل گوردتج کا بندر ہیٹ لگاتا، چشمہ پہنتا اور پورا 'جنٹل مین' بن جاتا۔ بندر اور مداری دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مقامی جنٹل مین ناراض ہو گئے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ بندر نچانے والے آج بھی بندر نچاتے وقت یہ مطالبہ ضرور کرتے ہیں کہ جنٹل مین بن کے دکھا۔ شاید اسی لیے انگریز نے ان کا شمار 'مجرم قبیلوں' میں کیا ہوا تھا۔ کبھی کبھی جب دن ڈھل رہا ہوتا ہے، مارگلہ سے اترتا ہوں تو یوں لگتا ہے جنگل سے بندر شور مچا مچا کر کہہ رہے ہوں: "جنٹل مین بن کر تو دکھاؤ" اور پہاڑ سے اترتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ سارا ہی شہر جنٹل مین بنا ہوتا ہے۔